راہِ نور
تحریر: میرا احمید

زندگی کی محراب پر درج تحریر کا پہلا لفظ ''موت''...... ہے۔

مسجدوں میں فجر کی نماز کے لیے جماعتیں کھڑی ہو رہی تھیں اور وہ اُنہیں اپنی کار میں بیٹھا کر مینٹل ہاسپٹل سے بھگا کر لے جا رہا تھا۔ کہیں بہت دُور۔ جہاں کوئی اُنہیں مرنے سے نہ روک سکے...... جہاں وہ تینوں اطمینان سے اجتماعی خودکشی کر سکیں......

ہادی...... طلال...... ابراہیم......

سفید کار لاہور کی حدود سے باہر نکل رہی ہے۔ فجر کی نماز ان بے نمازیوں کی قضاء ہو چکی ہے۔ جو زندگی کے فرض کو ''موت'' کی قضاء سے بدلنے جا رہے ہو' اُنہیں نماز' روزہ' زکوۃ' بندگی' سے کیا لینا دینا۔ اُنہیں کل بھی مرنا تھا اور آج بھی...... اُنہیں زندگی سے رات بھی بے زاری تھی اور آج اس نئے دن بھی......

مایوسی ایسا اندھیرا ہے جس کے اس پار کوئی چراغ جلتا ہوا دکھائی نہیں دیتا......

غم ایسی آگ ہے جو زندگی کے نخلستان کو جہنم میں بدل دیتی ہے......

ابراہیم...... یہ ڈرائیونگ کر رہا ہے۔ وہ ان دو سے قد میں لمبا ہے' پانچ فٹ دس انچ۔ سخت ورزشی جسم کا مالک ہے۔ اس کی ٹی شرٹ اور کھلے بٹنوں کی چیک شرٹ اس کے مسلز کی ساخت کو چھپانے میں ناکام ہیں۔ اس کی آنکھوں میں گہری اداسی کا گمان تو ہوتا ہے لیکن اس کے چہرے پر روشنی یہ یقین بھی دیتی ہے کہ اس کے اندر کہیں کوئی مشعل روشن ہے۔

ابراہیم نے ریڈیو آن کیا تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے طلال نے ہاتھ بڑھا کر بند کر دیا۔ طلال...... وہ ان دو میں سب سے زیادہ ہینڈسم اور چارمنگ ہے۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کبھی وہ کسی انٹرنیشنل برانڈ کا ماڈل ایمبیسڈر رہا ہوگا۔ اس کے چہرے کی سختی اور آنکھوں کی نمی کا تال میل نہیں بیٹھتا۔ وہ پتھر ہونا چاہتا ہے' اور آنکھ میں سمندر رکھتا ہے...... کیوں؟؟ کس لیے؟

پچھلی سیٹ پر سر گرا کر' ٹانگیں پھیلا کر ہادی پڑا ہے۔ اسے سورج' چاند' ستاروں' آسمان' دن' روشنی' انسانوں سمیت' دنیا کی ہر شے اور ہر نظارے سے شدید نفرت ہے۔ اسی لیے اس نے آنکھوں کو دونوں بازوؤں سے ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ جو آخری چیز دیکھنا چاہتا ہے وہ نئے ''دن کی روشنی'' ہے۔ وہ جس پہلی چیز سے دور بھاگتا ہے وہ ''اندھیرا'' ہے۔

''ہمیں کتنا وقت لگے گا وہاں پہنچنے میں؟'' ڈیڑھ گھنٹے بعد ہادی نے جھنجلا کر پوچھا۔ اسے راستے میں ریل کی پٹری نظر آئی تھی اور اس پر کٹا پڑا اپنا سر اور دھڑ......

''ڈھائی تین گھنٹے اور لگ جائیں گے......''

ابراہیم نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر۔ سورج کی کرنوں نے زمین کو روشن کرنا شروع کر دیا تھا۔ دُور ہر طرف کھیت لہلہا رہے تھے۔ نیلی، پیلی وردیوں میں بچے اسکولوں کی طرف جا رہے تھے۔ پیدل اور سائیکلوں پر لدے پھندے ٹلیاں کھڑکاتے، سائیکلیں لہراتے......اس نے ہارن دیا تو انہوں نے شرارتاً کار کا راستہ روک لیا......

''سپیڈ بڑھا دو نا یار! ڈر کر پیچھے ہو جائیں گے......'' ہادی کے لہجے کی تندی گواہ تھی کہ اس کے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔

''بچے ہیں یار! ذرا شرارت کر رہے ہیں......ابھی راستہ صاف ہو جائے گا......''

''اگر انہیں جانے کی جلدی ہے تو مجھے بھی مرنے کی جلدی ہے......تم سپیڈ بڑھاؤ بس......''

ابراہیم نے سپیڈ تو نہیں بڑھائی لیکن اس نے ہارن پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ بچے گردنیں موڑ موڑ کر کار کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ انہیں منہ چڑھانے لگیں۔ وہ سپیڈ بڑھا کر آگے نکلتا کہ سر پر گھاس کا گٹھا اٹھا کر پیدل چلتیں ماں جی نے ہانپ کر گٹھا بونٹ پر رکھ دیا اور کھڑکی کی طرف جھک کر کہا۔

''پتر! پانی ہے؟؟''

پتر ابراہیم نے پانی کی بوتل ان کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے اطمینان سے پانی پیا۔ پلو سے چہرے اور گردن کا پسینہ صاف کیا۔ بہت آرام و اطمینان سے گٹھے کو واپس سر پر جمایا اور کھڑکی کی طرف جھک کر کہا۔

''اللہ بھلا کرے......خیر پائے......''

زندگی کی خیر کو، موت کے حوالے کرتا ہادی ہاسپٹل کی ساتویں منزل پر جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اندھیرے کا شہر، مصنوعی روشنیوں میں ٹمٹما رہا تھا۔ اتنی زیادہ سختی کے باوجود وہ نائٹ ڈیوٹی اسٹاف کو چکما دینے میں کامیاب ہو کر، چھت کی طرف بھاگ گیا تھا۔ جس وقت وہ تقریباً چھلانگ لگا ہی چکا تھا، ٹھیک اسی وقت ابراہیم نے پیچھے سے آ کر اسے پکڑ لیا تھا۔ پورے ہاسپٹل میں الارم گونج رہے تھے۔ سارا شہر اس ہاسپٹل کے ساتھ جاگ گیا تھا۔ ساری دنیا نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈھونس لی تھیں۔ کائنات کی سانس وحیات نے اپنی آنکھیں میچ لیں تھیں......

اسٹاف کے گیارہ لوگ اسے گھسیٹ کر نیچے اس کے روم میں لائے تھے۔ نرس اسے انجکشن لگا رہی تھی۔

''چھوڑ دو خدا کے لیے......مجھے مرنے دو......مرنے دو مجھے......'' ہوش سے بے گانہ ہوتے ہوئے بھی وہ مسلسل یہی بڑبڑا رہا تھا۔ اپنا سر پٹخ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے تھے پھر بھی وہ تڑپ تڑپ کر ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔

''تم مرنا چاہتے ہو؟'' اس کا سر سہلاتے ہوئے ابراہیم پوچھ رہا تھا۔

اپنی بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے ہادی نے سوال پوچھنے والے کو دیکھنا چاہا۔ یہ سوال پوچھنے والا وہ پہلا شخص تھا۔

''ہاں! میری مدد کرو پلیز......'' اس کی دھندلی' بند ہوتی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آئے۔

''میں تمہاری مدد کروں گا...... میں کروں گا مدد...... میرا یقین کرو......''

وہ اس کے کان میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ابراہیم صبح تک اس کے سرہانے بیٹھا رہا تھا' اور بار بار یہی کہتا رہا تھا۔ ہادی کے نیم خوابیدہ دماغ نے ''میں تمہاری مدد کروں گا'' کا جملہ یاد کر لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے لیے مدد آ چکی ہے۔

''میں خود تمہیں ماروں گا۔ میرا وعدہ ہے تم سے...... لیکن تم خود سے کچھ نہ کرنا......''

ہادی بے یقینی سے ابراہیم کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہر ڈاکٹر' نرس' سوئپر' اسٹاف ممبر کی منت کر چکا تھا۔ انہیں پیسوں کا لالچ دے چکا تھا کہ وہ اسے زہر لا دیں' ورنہ ایک پسٹل یا پھر اس کا گلا گھونٹ دیں' بلندی سے کود جانے دیں۔ وہ کسی کا کچھ نہیں لے رہا۔ وہ تو اپنی چیز' اپنی زندگی لے رہا ہے۔ کسی کا اس سے کیا لینا دینا......

''اجتماعی خودکشی کے بارے میں تمہارا خیال ہے؟'' اسی دن شام کو ابراہیم اس سے پوچھ رہا تھا۔

''اجتماعی خودکشی......؟'' اس کی طرح باقی دنیا بھی مرنا چاہتی ہے' اسے اب معلوم ہوا تھا۔

''ہاں...... میں تم...... اور روم نمبر تین کا طلال......''

''وہ کیسے؟''

''ہاسپٹل سے باہر...... کہیں دُور......''

''دُور کیوں......؟؟'' وہ ایک ذہین اسٹوڈنٹ رہا تھا۔ ہینگ گلائڈنگ کا شاہین...... ماں کا شیر...... باپ کا ببر شیر...... اسے موت کو پا لینے کی جلدی تو تھی لیکن لمبی میعاد اور فاصلوں سے نفرت تھی۔

''وہاں ہمیں کوئی روک نہیں سکے گا۔ کوئی بچانے والا بھی نہیں ہوگا۔ ہمیں کفن دفن کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔''

''موت کے لیے مجھے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا......؟'' اسے بس فوراً موت چاہیے تھی۔

''تھوڑا بہت تردد تو بہر حال کرنا ہی پڑے گا......'' ابراہیم نے سکون سے کہا۔

''میں ٹرین کی پٹری پر لیٹ کر مرنا نہیں چاہتا نہ کسی پہاڑ سے کود کر۔ دریا میں چھلانگ لگا کر بھی نہیں' مجھے پانی سے خوف آتا ہے۔ میں کنپٹی پر پسٹل رکھ کر یا زہر کھا کر مرنا چاہتا ہوں۔ ورنہ تم میرا گلا گھونٹ دو۔ میں نہیں چاہتا کہ میری لاش گدھ کھائیں یا چیل کوّے۔''

''فکر نہ کرو' تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور تم مر جاؤ گے۔'' ایسی خوفناک بات ابراہیم نے مسکرا کر کی۔

''ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟'' اسے شک تھا کہ ابراہیم اسے بہلا رہا ہے۔

''وہ مجھ پر چھوڑ دو...... میں نے انتظام کر لیا ہے......''

اس نے انتظام کر لیا تھا۔ اسی لیے اذانِ فجر سے پہلے وہ انہیں اپنی سفید کار میں بٹھا چکا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر طلال کو اور پچھلی سیٹ پر

ہادی کو...... ہادی جسے ہواؤں کا شاہین بننے کا شوق تھا۔

شاہین جو بلندیوں کا پرندہ ہے......

شاہین...... جسے پستیوں سے کچھ لینا دینا نہیں......

سڑکیں سنسان تھیں...... اندھیرا روشنی سے جا ملنے کے لیے تیار تھا اور...... ''زندگی موت'' سے......

☆ ☆ ☆

صبح کی اُمید بھری فضا، دن کی مکاری میں بدلنے لگی۔

''ذرا تیز گاڑی چلاؤ......'' وہ غصیلا، بدتمیز اور بے ادب۔ اس نے اپنی دوا نہیں کھائی تھی اسی لیے وہ پاگل پن کی حد تک چڑچڑا ہو رہا تھا۔

''میں تھک چکا ہوں۔'' اس نے کار کو سڑک کے کنارے روک لیا۔

''تم تھک چکے ہو تو ہمیں کیوں تھکا رہے ہو...... کیا چاہتے ہو...... اتنی دُور کیوں لے آئے ہو ہمیں؟''

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم چپ رہو گے، کوئی سوال نہیں کرو گے۔ جو میں کہوں گا وہی کرو گے۔'' ابراہیم نے اچٹتی نگاہ سے اسے دیکھا اور سیٹ کے نیچے ٹانگیں پھیلا لیں۔

''ہونہہ...... بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا پلان......''

کار سے اتر کر، دروازے کو دھاڑ بند کر کے تیز تیز قدم اٹھاتا وہ کار کی مخالف سمت چلنے لگا۔ اسے آس پاس کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جو اس کا کام تمام کرنے میں اس کی مددگار بن سکتی۔ ٹرین کی پٹری، وزنی پتھر ورنہ پہاڑ کی بلندی......

تیزی سے کار سے نکل کر ابراہیم اس کی سمت بھاگا۔ پیچھے سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پوری قوت سے ایک گھونسا اس کے جبڑے پر مارا۔

''مردوں کی طرح مرنے جا رہے ہو، پہلے مردوں کی طرح زبان کا پاس رکھنا سیکھو۔ سمجھے......؟؟''

ایک گھونسے کے بعد اس نے اسی گال پر دو اور گھونسے مارے۔ خون سے اس کا منہ بھر گیا۔ تکلیف سے بے حال ہو کر وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ پچھلے گیارہ مہینوں سے وہ تکلیف میں تھا۔ چھ مہینے سے مینٹل ہاسپٹل میں تھا۔ دوائیوں پر زندہ تھا۔ اس کے جسم میں بچا ہی کیا تھا جو وہ تین گھونسے سہہ سکتا۔ ابراہیم کا ہاتھ روک لیتا ورنہ جوابی حملہ ہی کر دیتا۔

فرنٹ سیٹ پر بیٹھا طلال اپنے ناخن چباتا رہا۔ اس نے گردن ان کی طرف گھما کر یہ تک دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اسے خود سمیت دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ خود بھی مر جائے اور ساری دنیا بھی تباہ و برباد ہو جائے۔ طوفان آئے یا زلزلہ۔ جنگ ہو یا کہرام برپا۔

وہ تین مہینے پہلے ہاسپٹل آیا تھا۔ اس نے ہاسپٹل میں ایک ہی بار خودکشی کی کوشش کی تھی، لیکن وہ طریقہ ایسا حیران کن اور ششدر کر

دینے والا تھا کہ ڈاکٹرز اور ہاسپٹل کا پورا اسٹاف کتنی ہی دیر تک ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کے کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے وہ اپنے لیے خطرہ بن سکتا۔ پھر بھی...... اپنی دو ٹانگوں کو قینچی بنا کر اس نے اپنی گردن کو اس میں ایسے پھنسا لیا تھا کہ اگر اسٹاف تیس سکینڈ اور لیٹ ہو جاتا تو اس کی گردن کا منکا ٹوٹ چکا ہوتا۔

زندگی کی محراب سے گر کر ٹوٹا ہوا ہادی زمین پر لاش کی طرح پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کے سر پر کھڑا ابراہیم اسے افسوس سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ پنجوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا اور رومال نکال کر اس کے منہ سے خون سے صاف کرنے لگا۔

''اپنی اتنی توہین نہ کرو ہادی! ویسے بھی آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔ اس دن پر تھوڑا سا تو احسان کرو۔ مرنے سے پہلے اسے زندہ رہ کر دکھاؤ۔''

ذرا سا سر اٹھا کر اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ اس کی پشت سے نکلتیں سورج کی کرنیں' اس کی اندھیرا آنکھوں کو تکلیف پہنچانے لگیں......

''اُٹھ جا پتر! دن نکل آیا ہے' پرندے اپنا رزق کھا مکا بیٹھے ہیں۔ اُٹھ جا......'' سورج کی کرنیں نیم کے درخت سے چھن کر' ماں کی گلابی چنی کو چومتیں' اس کی آنکھوں کو بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔

''دو ہفتوں کے لیے آیا ہوں ماں جی! سکون سے سونے تو دیں...... اور بھلا یہ سورج اتنی جلدی کیوں نکل آتا ہے۔''

''سورج اپنے وقت پر نکلتا ہے' تو اپنا وقت سو کر برباد نہ کر۔ اُٹھ جا۔ ماں کے پاس بیٹھ کر چار باتیں کر لے۔''

ماں پتر دیاں چار گلاں......

اک ماں میری او پیاری...... اس ماں نال میری یاری...... میرا دل تے میری حیاتی...... اس ماں توں جند واری......

وہ اٹھا اور نقاہت سے چلتا ہوا کار کی چھت پر دونوں ہاتھ ٹکا کر ہانپنے لگا۔ چند آنسوؤں نے اس کی پوری آنکھیں بھگو دیں۔ ابراہیم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا اور اسے بیک ویو مرر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جواب آستین سے اپنی آنکھیں رگڑ رہا تھا......

''پانی پی لو......'' پانی کی بوتل لے کر وہ باہر نکلا۔

وہ اپنے آنسو پی چکا تھا' پانی کو اس نے اس قابل نہیں سمجھا۔ دروازہ دھاڑ بند کر کے' سیٹ پر آڑا ترچھا دراز ہو کر اس نے آنکھوں کو بازوؤں کی آڑ میں چھپا لیا......

ماں پتر دیاں چار گلاں......

☆ ☆ ☆

چالیس منٹ بعد وہ تینوں کھیوڑہ کان کے باہر کھڑے تھے۔ ٹکٹ ابراہیم کے ہاتھ میں تھے۔

''تم ہمیں یہاں سیر کروانے لے کر آئے ہو؟'' ہادی نے خونخوار نظروں سے ابراہیم کو گھورا۔ طلال بھی ابراہیم کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''مرنے کے لیے اس سے بہتر جگہ پورے پاکستان میں کہیں نہیں ملے گی۔''

''ساری دنیا کو فتح کرتا سکندر اعظم جب یہاں سے گزرا تو اس کی فوج کے گھوڑوں نے پہاڑوں کو چاٹنا شروع کر دیا تھا۔ پتھر کو توڑ کر دیکھا تو اندر نمک تھا۔ ایسے یہ کھیوڑہ کان دریافت ہوئی تھی۔ یہ دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کان ہے۔ یہ اتنی گہری اور لمبی ہے کہ......''

گائیڈ اسکول کے بچوں کو کان کے دہانے کے پاس کھڑا کر کے لیکچر دے رہا تھا۔ ایکدم سے وہاں بچوں کا انتشار بڑھ گیا تھا کہ ان تینوں کو ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دینا پڑا تھا......

''سکندر اعظم کان کے اندر گیا تھا؟'' ایک بچے نے چلا کر پوچھا۔ دوسرے بچوں نے ایسے بے تکے سوال پر قہقہہ لگایا۔

''سکندر یہاں سیر سپاٹے کرنے نہیں آیا تھا' یہ خطہ فتح کرنے آیا تھا۔ جنگجو تھا وہ......'' گائیڈ چڑ گیا۔

''پھر ہم اندر جا کر کیا کریں گے جب سکندر ہی کان کے اندر نہیں گیا تو......'' بچے کو ساری دلچسپی صرف سکندر سے تھی۔

''تمہیں وہ نہیں کرنا جو سکندر نے کیا تھا' ''جنگ اور فتح''۔ تمہیں وہ کرنا ہے جو وہ نہیں کر سکا تھا۔ ''زندگی اور انسانیت سے محبت۔'' زندگی اور انسانیت سے محبت......

تینوں بے زار سے کھڑے یہ آخری فقرہ سن چکے تھے۔ ہادی چند سیکنڈز تک ٹکٹکی باندھ کر ابراہیم کو دیکھتا رہا۔

''کیا تم ہمیں کسی بھی طرح سے پاگل بنانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''میں تمہیں مینٹل ہاسپٹل سے بھگا کر لایا ہوں۔ تم پاگل ہی ہو......'' اس کا لہجہ سخت اور سرد تھا۔

ان دونوں کے ہاتھ میں ان کے ٹکٹ تھما کر اس نے اپنے قدم اندر کی طرف بڑھا دیئے تھے۔ روشنی جو کان کے دہانے پر گر کر پھیلی ہوئی تھی' وہ اندر قدم بڑھاتے بڑھاتے معدوم ہونے لگی تھی۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر چلتا رہا۔ اس کی حسیں پوری طرح سے بیدار تھیں۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے پیچھے طلال اور پھر ہادی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

کان میں عام لوگوں کا رش بڑھ رہا تھا۔ انہیں جگہ بنا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ ہادی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مرنے کے لیے نمک کی کان کا انتخاب بھی کیا جا سکتا ہے۔ کسی عوامی مقام کا۔ اسکولوں کے تین چار سو بچوں کی موجودگی میں انہیں مرنا ہوگا۔ ایک سال پہلے تک اسے پہاڑ بہت پسند تھے' لیکن صرف بلندی سے۔ اب وہ اس بلندی کی کھوہ میں جا رہا تھا۔ اسے اس عمل سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

''تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو۔ ہم یہاں کیسے مر سکتے ہیں؟'' ہادی نے پیچھے سے اس کے کالر کو پکڑ کر جھنجوڑا۔

''دوبارہ گریبان تک نہ آنا۔ ورنہ اس بار گھونسہ پیٹ میں ماروں گا اور آنتیں نکل کر باہر آ گریں گی۔ چپ چاپ میرے ساتھ چلتے رہو۔ اگر میں نہ ہوتا تو تم مر کر بھی اس ہاسپٹل سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ میرا احسان مانو۔ تمیز سے بات کرو اور سامنے دیکھ کر سیدھ میں چلتے رہو۔''

سامنے دیکھتے ہوئے وہ سیدھ میں چلتے رہے۔ کان کا نمک پانی بن کر ٹپ ٹپ ٹپک رہا تھا۔ چھوٹی تنگ سی راہداری گیلی ہو رہی تھی۔ وہاں ٹھنڈک تھی' اندھیرہ تھا' اور ٹپ ٹپ پانی تھا۔ لوگوں کی باتیں' بچوں کی ضدیں' ماؤں کی تکراریں۔ نمک کی اس کان میں کتنا کچھ

تھا۔زندگی پہاڑ کی کھوہ میں بھی چہل پہل رہی تھی۔

''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔'' ہادی تھک کر نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔وہ دو گھنٹے سے **مسلسل** چل رہے تھے۔

''مرنے جا رہے ہو اور زندگی کی بوند بوند کے لیے تڑپ رہے ہو۔کیسے دوغلے انسان ہو۔پانی کی بوتل کار میں رہ گئی ہے۔'' ابراہیم نے بیزاری سے کہا۔

کان کے جس حصے میں وہ آ چکے تھے یہاں اب عوامی رش نہیں رہا تھا۔لگتا تھا جیسے ساری کائنات پر رات چھا گئی ہے۔ابراہیم کے ہاتھ میں لائٹر تھا' اب وہ اسی کی روشنی میں چل رہے تھے۔انتظامیہ کی طرف سے روشنی کا انتظام جہاں تک تھا' وہ حصہ وہ بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

''آگے خطرہ ہے۔اس طرف جانا منع ہے۔''

کھوپڑی کے کراس سائن کے نیچے ہدایات لکھی تھی۔کھوپڑی اور تنبیہ دونوں کو صاف نظر انداز کر کے ابراہیم چھوٹے سے لوہے کے دروازے کو کھول کر' جھک کر' اندر چلا گیا اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

غیر ارادی طور پر اندر جانے سے پہلے دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔بہت دُور انہیں روشنی کی کچھ آخری کرنیں نظر آئیں۔بچوں اور عورتوں کی آوازوں کی بھنبھناہٹ۔کان سے باہر' آسمانی جھولے کی گڑ گڑ۔تیس روپے کی آئس کون والے کی صدا۔دس روپے کے پاپ کارن والے کی پکار...... دُور نیلے آسمان پر روشن سورج کا الوداعی سانس اور رات کے آسمان کے ستاروں کا سناٹا......

کان کے اندھیرے میں سورج روشن تھا نہ ستارے...... وہاں بس اندھیرا تھا......

کان کی ٹھنڈک میں زندگی کی گرمی تھی' نہ موت کی نرمی...... وہاں بس بے رخی تھی......

دونوں سر جھکا کر خطرے کو نظر انداز کر کے اندر چلے گئے۔

چیک شرٹ کے بازو فولڈ کیے ابراہیم اطمینان سے چل رہا تھا۔وہ اتنا پرسکون تھا' جیسے کسی ایسی غار کو ڈھونڈ رہا ہو' جہاں سے موت کے فرشتے' خوش گپیاں کرتے ہوئے نکلیں گے۔ان سے ہاتھ ملائیں گے' خوش آمدید کہیں گے اور اپنی سواریوں پر بٹھا کر زندگی سے نکال کر موت کی طرف لے جائیں گے......

ابراہیم...... اس جیسے ایشین گولڈ میڈلسٹ باکسر کو موت کا خیال آیا ہی کیونکر تھا...... پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں لے کر' ملکی جھنڈے کو لہراتے ہوئے وہ تو رنگ میں ناچتا' کودتا' دوڑتا پھر رہا تھا۔اس نے ایشین گولڈ میڈل جیت لیا تھا۔اس نے ایمان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے منہ دکھائی میں ''گولڈ میڈل'' دے گا۔منہ دکھائی کا تحفہ اس نے حاصل کر لیا تھا۔نکاح کی تیاریاں بھی ہو گئی تھیں...... پھر...... پھر......

خطرے کے نشان کو پار کر کے چلتے ہوئے انہیں کافی وقت گزر چکا تھا۔وہ کان کے اس حصے میں آ چکے تھا جہاں انتظامیہ کے چند لوگوں کے سوا باہر کی دنیا کا کوئی انسان کبھی آیا ہی نہیں تھا۔

''تم اس جگہ کو کیسے جانتے ہو؟ پہلے آ چکے ہو یہاں؟'' ہادی بری طرح سے ہانپ رہا تھا۔

''کان کا نقشہ میں نے انٹرنیٹ پر دیکھ لیا تھا۔'' اس نے ایسے کہا جیسے اس نے کوئی بڑا معرکہ سرانجام دیا ہو۔

''تو مرنے کے لیے تم نے اس جگہ کو ہی کیوں پسند کیا؟'' طلال نے یہ پہلی بات' پہلا سوال کیا تھا۔

''کیونکہ یہ جگہ ٹھنڈی ہے اور موت کی گرمی کو تھوڑی ٹھنڈک بھی نصیب ہونی چاہیے۔ یہاں ہماری لاشوں کی بے حرمتی بھی نہیں ہو گی۔''

''مرنے کے لیے اتنا سوچ بچار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنی پلاننگ تو زندہ لوگوں کو زیب دیتی ہے۔'' ہادی نے اداسی سے کہا۔

☆ ☆ ☆

یقیناً شام کے' چار پانچ بج چکے ہوں گے۔ کان کے ورکر ایک آخری چکر لگا کر بچے کچے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر باہر نکال رہے ہوں گے۔ صرف نمک سے بنے اس چھوٹے سے ہاسپٹل میں استھما کے چند مریض موجود ہوں گے۔ ایک ڈاکٹر' نرس اور دو چار دوسرے لوگ۔ ورنہ ساری کان خالی ہو چکی ہو گی۔

''ایک دوسرے کی شرٹ پکڑ لو۔ ہادی تم میری' طلال تم ہادی کی۔ اب بس میرے ساتھ گھسٹتے ہوئے چلو۔'' ابراہیم نے ایکدم سے لائٹر بجھا دیا۔

''تم نے لائٹر کیوں بند کر دیا ہے؟''

''اب ہم ایک خوفناک چھوٹے سے پل پر سے گزر رہے ہیں...... ویسے کیا تم خوفزدہ ہو؟'' اس نے ہادی کا سوال نظر انداز کر دیا۔

ہادی لب بھینچ کر چپ ہو گیا۔ اس نے ابراہیم کی شرٹ کا کونا پکڑ لیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ہزاروں فٹ بلندی پر موجود ہیں۔ نیچے کھائیاں' دلدل' اور زہریلے سانپ بچھو ہیں۔ تین دن پہلے تک وہ زندگی کے خوف سے چیخیں مارتا رہا تھا۔ ''میں زندہ ہوں'' کہ خوف سے اس کی گھگھی بندھ جایا کرتی تھی کہ ساری خدائی کو اس کے حال پر ترس آیا کرتا تھا۔ اب وہ سانپ بچھوؤں سے ڈر رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ...... کل اس وقت تک ہم مر چکے ہوں گے۔''

'ابراہیم نے لائٹر روشن کر کے ایک آخری بار ان کی شکلیں دیکھیں اور پھر ذرا سا باہر کی طرف نکل کر لائٹر پھینک دیا۔ وہ ایک چھوٹی سی کھوہ میں کھڑے تھے جہاں جھک کر کھڑا ہونا پڑ رہا تھا۔ جا بجا نکلیں نمک کی قلمیں ان کے جسموں کو مس کر رہی تھیں۔

ایک لمحہ زندگی کا لمحہ بن کر آیا......

''کان کے باہر رات ہونے والی ہو گی۔ چاند نکلنے والا ہو گا'' کونے میں سکڑ کر بیٹھے ہادی نے زندگی کے بارے میں سوچا۔

اس اندھیری قبر سے باہر اس کے گاؤں میں ہرے بھرے کھیت لہلہاتے ہوں گے۔ مائی سوداں کا چرخہ گھوں گھوں کرتا ہو گا اور تالاب کے پانی میں بطخیں اپنے پر پھڑپھڑاتی ہوں گی۔ دانے دنکے کی جنگ لڑتیں مرغیاں اور مرغے۔ کچی پگڈنڈیوں پر خالی ٹائر دوڑاتے بچے۔ نہر کنارے بنے اسکول کی گھنٹی کی ٹن ٹن' سبق کے رٹے اور لمبے لمبے سانس کھینچ کر پہاڑوں کے رٹے۔ یہ آوازیں آج بھی گاؤں میں سانس لیتی ہوں گی۔ دیسی انڈے' چوزے چرا کر بھاگتا رشید۔ غلیل سے چڑے مار مار' بھون بھون کھاتا وزیر۔ ان کی ہنسی ان کی ساری

ہستی بنتی ہوگی...... آج بھی' گاؤں پر شام سہانی شہابی چنری اوڑھ کر اتری ہوگی۔

ہادی کی حالت بگڑنے لگی تھی۔وہ دوا کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے سر میں جھکڑ چلنے لگے تھے۔اندھیرا اسے خوفزدہ کرنے لگا تھا۔لیکن کوئی شخص بازار سے اندھیرے لینے جائے اور یہ توقع رکھے کہ دکاندار بدلے میں اسے چراغ دے دے گا تو ایسا شخص دیوانہ ہی ہوسکتا ہے۔

تمہیں مرنے کے لیے کوئی آسان طریقہ نہیں ملا تھا۔'' طلال پھٹ پڑا۔وہ ایسے ہی ایکدم سے پھٹتا تھا۔

''سوچا شیروں کی طرح زندہ نہیں رہے تو شیروں کی طرح مر ہی جائیں...... '' ابراہیم نے طنزیہ کہا اور قہقہہ بھی لگایا۔

طلال کا دل چاہا کہ وہ اٹھے اور اس کی گردن دبوچ لے۔وہ اٹھا بھی' لیکن کمزوری کی وجہ سے ہادی کے پاؤں سے الجھ کر گر گیا۔

''زیادہ غصہ نہ کرو اور چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔شاباش۔'' ابراہیم نے پچکارا۔وہ اسے اور غصہ دلا رہا تھا۔

''منحوس انسان......ہمیں تکلیف میں دیکھ کر تمہیں ہنسی آ رہی ہے......'' اس کی آواز گھٹنے لگی۔

''یہ تکلیف میں نے تو تمہیں نہیں دی؟؟''

''تم مکار اور چالاک ہو......کمینے انسان......''

''او کے! میں یہ سب ہوں؟ تم کیا ہو؟ عقل مند؟ سمجھ دار؟ بہادر؟؟''

جواب میں خاموشی رہی......

☆ ☆ ☆

رات تین پہروں میں سے پہلے پہر میں داخل ہو چکی تھی...... پہلا پہر شیطان کے وسوسوں اور خوف کا پہر۔

ہادی پر نیم غنودگی طاری ہو چکی تھی۔اور جب اسے لگا کہ موت اس کے سرہانے آ کر کھڑی ہو چکی ہے۔سارا جہاں جو اس کی مٹھی میں بند تھا' ہاتھ سے پھسلنے لگا ہے تو اس نے ایک سسکی لی۔آنسو اس کے گال پر پھسلے۔اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے ایسے مرنا پڑے گا۔وہ تو زندہ رہنا چاہتا تھا......ہمیشہ سے......

☆ ☆ ☆

''دنیا میں سب سے خوب صورت کیا ہے......؟؟

''پرندے......''

''پرندوں میں سب سے خوبصورت......؟؟''

''اونچی پرواز والے پرندے......''

''اونچی پرواز والوں میں......؟''

جو پہاڑوں پر بسیرا کریں......بلند پرواز' خلوت نشین' تیز نگاہ' غیرت مند...... ''شاہین۔''

کہہ کر بلند حوصلہ شاہین' جوش سے چلاتے ہوئے پہاڑ کی بلندی سے کود گیا۔ ہینگ گلائڈنگ کی یہ اس کی پہلی سولو پرواز تھی۔(مصنوعی پتنگ کے ذریعے اڑنا)۔بچپن میں وہ ''چڑا'' تھا۔ پھر چیل ہوا'' اب وہ شاہین تھا۔ زمین کی بلندی سے پرواز کرتا ہوا' آسمان پر کسی پرندے کی طرح اڑتا ہوا۔

سبزے کے قطعے' پہاڑوں کا خاندان' جھنکار کی طرح گرتی آبشار' تپلی لکیر بناتا دریا' پھر پھر اڑان بھرتے چھوٹے پرندوں کا اہل و عیال......اچھا تو اوپر سے زمین ایسی دکھائی دیتی ہے۔ پہلے معلوم ہوتا تو وہ سفید بادلوں پر ایک گھر بنالیتا۔ گھر کی کھڑکیاں کھول کر روز ایسا نظارہ کرتا......

ہواؤں کے قافلے' روشنی کے مسافر اس کے لیے تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ اُڑ رہا تھا......وہ اڑ رہا تھا......

''ماں جی آپ کا بیٹا شاہین بن گیا ہے۔'' نیچے اترتے ہی اس نے سب سے پہلے ماں جی کو فون کیا تھا۔ خوشی سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔

''میرا پتر تو شیر ہے......ہادی! بس اب گھر آجا۔ بہنوں کی شادی کے دن قریب آرہے ہیں۔''

''بس ماں جی! آیا کہ آیا......''

انگلینڈ سے وہ جہاز سے آیا تھا۔ اڈے سے بس سے' اور پھر اسٹاپ سے جلال کی جیپ میں۔ تین دن پہلے اس کا سمسٹر ختم ہوا تھا۔ ماں جی نے اسی کی وجہ سے شادی کی تاریخ کو روکا ہوا تھا۔

نومبر کے آخری دنوں کی دھوپ نے جگنوؤں کو اپنا مہمان بنا کر ہڑپ کرلیا تھا۔ سونے میں چاندی کے ورق گھول کر روشنی کی کرنوں نے' نومبر پر بڑا احسان کیا تھا۔ اس دن ماں بڑی خوش تھی۔ جہیز کے سامان کو دھوپ لگوا رہی تھیں۔ ابا جی نیم کے درخت سے ذرا پرے موڑھے پر بیٹھے مددو کے ساتھ مل کر شادی کے انتظامات کا حساب کتاب دیکھ رہے تھے۔ چارپائی پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں دراز دادا جی حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ بہنیں مہندی' چوڑی' گوٹا چیز کی مصروفیت کے ساتھ بڑی اترائی اترائی سی تھیں۔ کچھ دیر پہلے اس نے آپا کا پراندہ مٹھی میں لے کر کھینچا تو انہوں نے دھوپ میں سوکھتی مرچوں کو ہتھیلی پر مسل کر اس کی آنکھوں میں بھر دیا۔

''شیر ہوگا ماں کا......میرے لیے تو ڈڈو ہے......ڈڈو......''

ڈڈو نے بدک کر پھر سے آپا کا پراندہ پکڑنا چاہا لیکن جلال نے پیچھے سے آکر خلل ڈال دیا۔ بدلے کو موخر کیا اور جلال کے ساتھ چھت پر چڑھ گیا۔ اسے ہوا میں اُڑنے والی ہر چیز بہت پسند تھی......پتنگ بھی......

وہ چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ مانجا لگی ڈور اتنی تیز نہیں تھی جتنی تیز اور کٹیلی ایک ساتھ کئی جیپوں کے رکنے کی آوازیں تھیں کہ ڈور اس کی ہتھیلی کو چیرا لگاتی ہوئی نکل گئی۔ خون کی پتلی دھار اس کی ہتھیلی پر ابھری اور اس کا سانس گم ہوگیا۔ جلال منڈیر کے پاس کھڑا تھا' اس نے جھانک کر نیچے دیکھا اور اس کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔

گھر کا پھاٹک مردانہ ٹھوکروں سے دھاڑ کھلا تھا۔ آٹھ لوگوں کو مارنے کے لیے وہ اتنی فوج اور اسلحہ لایا تھا......جب تک وہ نیچے

جھانکنے کے لیے منڈیر تک آیا تب تک جہیز کو دھوپ لگواتی اس کی ماں کا سینہ گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ زمین پر گرے اس کے جسم کے قریب خون اپنے نشان چھوڑنے لگا تھا۔

''ابا جی......''

جب تک دوسری منڈیر کی طرف بھاگ کر اس نے حلق کے بل چلا کر کہا' تب تک فائر ابا جی اور دادا کے جسموں کے آر پار ہو چکے تھے......اور جب تک وہ سیڑھیاں پھلانگتا' گرتا پڑتا' پہلی منزل کی سیڑھیوں تک آیا' اس وقت تک فائرنگ کی آوازیں سن کر کمروں سے نکل کر باہر کو بھاگتیں اس کی بہنیں......تینوں بہنیں......

اس کے جسم سے جان نکل چکی تھی......وقت کی ساری کڑیاں' ٹوٹ کر بکھر چکی تھی......وہ جان گیا تھا کہ نیچے کوئی نہیں بچے گا۔

تین لاشیں پچھواڑے کے درخت کے پاس پڑی تھیں......ابا جی' دادا جی اور ممدو کی۔ اس طرف ماں کے ساتھ مائی رحمتاں کی......اور......اور گوٹا کناری لگے پیلے سوٹ میں آپا روزینہ کی۔ برآمدے کے پاس زینب کی' اور نیم کے درخت سے ذرا دور' چھوٹی سحر کی۔ ابا کی لاڈلی' مرنے سے پہلے بھی ان ہی کی طرف بھاگی تھی......

تین دن بعد اسے ایک چھوٹے سے ہسپتال میں ہوش آیا تھا۔ اپنی جان پر کھیل کر جلال نے اسے حویلی کے پچھلے پھاٹک سے باہر نکال لیا تھا۔ وہ دو گولیوں کے وار سے تو بچ گیا لیکن خاندان بھر کی موت کے غم کی کاٹ سے کیسے بچتا......

اس کے دادا کو اپنے چچا زاد سے نہری زمین کا مقدمہ نہیں جیتنا چاہیے تھا۔

اس کے ابا جی کو دادا جی کو روک دینا چاہیے تھا۔ وہ گاؤں ہی چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ اماں نے اتنا جہیز کس لیے اکٹھا کیا تھا۔ جب ان تینوں کو صرف کفن ہی نصیب ہونے والا تھا۔ سہاگ کے کپڑے اور بارات کی روٹی......ماں جی نے کیسی بدشگونی کر دی تھی......

ہوش میں آنے کے تین دن بعد تک وہ گم صم لیکن نارمل رہا تھا۔ پھر رات کے اندھیرے میں وہ گاؤں کے قبرستان گیا تھا۔ ماں جی کے پاس' ابا جی کے پاس۔ جھلمل ہنسی ہنسنے والیوں کے پاس۔ چھ قبروں کے سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھنا آسان نہیں تھا۔ وہ کس کس سے لپٹ کر روتا۔ وہ کس کس سے بچھڑ جانے پر ماتم کرتا۔ لوگوں کی دنیا لٹتی ہے' اس کا تو جہاں ہی لٹ گیا تھا۔

اور پھر وہ پاگل ہو گیا۔ اگلی بار جب اسے ہوش آیا تو چھ مہینے گزر چکے تھے۔ جلال اسے ایک مینٹل ہاسپٹل میں داخل کروا چکا تھا۔ وہ ہر مہینے اس سے ملنے بھی آتا تھا لیکن وہ اسے بھی نہیں پہچانتا تھا۔ چھ مہینے کے علاج کے بعد اس کی ذہنی حالت میں بہتری آنے لگی تھی۔ اسے آہستہ آہستہ سب یاد آنے لگا تھا' اور یہی برا ہو رہا تھا۔ ایک رات اسے سب یاد آ گیا تھا اور اسی رات اس نے پہلی بار گلے میں پھندا ڈالا تھا۔

ماں کی کھلی آنکھوں کی آہ' باپ کا ڈھلکا ہوا سر' بہنوں کی چیخیں اور اُڑتے ہوئے آنچل۔ جلال نے اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ کر اسے چیخنے سے روک لیا تھا پھر بھی دوسری منزل کی کھڑکی سے اس نے دیکھ لیا تھا۔ دیکھ لیا تھا کہ ابا جی کے خون سے لت پت وجود پر وہ تھوک رہا تھا۔ اپنے جوتے سے ان کا منہ مسل رہا تھا۔ ماں کی آنکھیں اُوپر منڈیر کی طرف اٹھی رہ گئی تھیں۔ انہیں مرتے ہوئے بھی صرف اپنے شیر

کی فکر تھی۔ اپنی موت کو سامنے دیکھ کر بھی سلامتی کی دعا انہوں نے اسی کے لیے کی ہوگی...... آخری دعا...... ماں نے وہ بھی اس کے نام ہی کر دی ہوگی......

زندگی دی چار ہی گلاں...... ایک ماں پیاری...... ایک باپ دلارا...... اک مائی جائی' اک ماں جایا......

چار دن دی زندگی' زندگی دی چار ہی گلاں...... اک ماں پیاری...... اک ماں دلاری...... اک ماں' اک ماں......

☆ ☆ ☆

رات کا دوسرا پہر...... پناہ کا پہر......

اپنی ساری ہمت جمع کر کے ہادی اٹھا' اور ٹٹول کر ابراہیم کے گلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''چوہے کی طرح بل میں گھس کر مردہ ہونے سے بہتر نہیں تھا کہ ہم زہر پھانک لیتے۔'' پہاڑوں سے کود کر' شاہین کی طرح آسمان میں اُڑنے والا چوہے کی طرح مرنے سے ڈر رہا تھا۔ ماں کا شیر...... باپ کا ببر شیر...... ہواؤں کا شاہین......

ابراہیم نے سکون سے اس کے ہاتھ اپنے گلے سے پیچھے ہٹائے۔

''اتنے ہی باہمت تھے تو زندہ رہ کر دکھاتے نا۔ اچھا اب چلے جاؤ۔ باہر نکلو اور زہر پھانک لو' ٹرین کے نیچے آ جاؤ۔ بلڈنگ سے کود جاؤ...... پھندے سے لٹک جاؤ...... جاؤ۔'' ابراہیم عاجز آ کر چلانا بھی جانتا تھا......

غصے سے ہادی کپکپانے لگا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور کھوہ کی دیواروں کو ٹٹول کر باہر نکلنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ تین بار وہ طاہل سے ہی ٹکرا کر گر گیا اور ہانپنے لگا۔ وہ ذہنی مریض تھا' آسانی سے سوئی میں دھاگہ تک نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کا ارتکاز منتشر ہو جاتا تھا۔ سامنے پڑی چیز مشکل سے دکھائی دیتی تھی۔ اب وہ کان سے نکل کر' موت سے بھاگ کر زندگی تک کیسے چلا جاتا۔

وہ کھوہ سے باہر نکل گیا۔ پھر اس کے قدموں کی چاپ دُور سے سنائی دینے لگی۔ وہ خود ہی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک ہی جگہ کا دس بار چکر لگا چکا ہے۔ اس کی سانس اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

''مجھے یہاں سے باہر نکالو۔ کوئی ہے...... میری مدد کرو......'' زمین پر گر کر وہ سسکتے ہوئے چلانے لگا۔

ابراہیم سچے جھوٹے ملاوٹ بھرے انداز سے مسکرا دیا۔ وہ انہیں کان میں اتنی دُور لے آیا تھا کہ اس حصے میں چھوٹا سا دھماکا بھی کر دیا جاتا تو اس دھماکے کی آواز باہر کسی انسان کو سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ پہاڑوں کے اوپر آوازیں گونجتی ہیں لیکن پہاڑوں کی تہوں میں آوازیں دم توڑ دیتی ہیں۔

''میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔'' بہت وقت بعد ہادی کھوہ تک واپس آنے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔

''کیوں؟ مرنے کا ارادہ بدل دیا ہے؟'' ابراہیم پھر طنز سے ہنس دیا۔

''مجھے یہاں سے نکالو......'' اس نے اپنے سر کو دیوار پر دے مارا۔ ''خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو'' وہ رونے لگا۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے لائٹر پھینک دیا ہے۔ اگر میں بھی چاہوں تو یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ میں نے تمہیں اور خود کو پوری

طرح سے موت کے حوالے کر دیا ہے۔ اب پرسکون رہو۔ جو تھوڑی بہت انرجی بچی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی اور ہم میں بولنے کی سکت بھی نہیں رہے گی۔ غنودگی ہی ہم پر موت طاری کر دے گی اور پتا بھی نہیں چلے گا۔ تم کیا کہتے ہو طلال...... طلال...... طلال؟''

ہادی نیم دیوانہ سا ہو کر طلال کو ٹٹولنے لگا۔ ''کیا وہ مر گیا...... اتنی جلدی...... اتنا خوش نصیب......؟''

اس کی ناک پر ہاتھ رکھا تو سانس چل رہی تھی۔ ''طلال...... طلال......؟؟'' اس نے جھنجھوڑ کر اسے اٹھایا۔

''دفعان ہو جاؤ کتوں...... سکون سے مرنے تو دو......''

''ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے......'' ہادی چلایا۔ ''ایسے یہاں ہم جلدی نہیں مریں گے۔ بہت سسکنا پڑے گا۔''

ابراہیم نے قہقہہ لگایا۔ ''اب تم ڈر رہے ہو...... ہے نا؟ موت کوئی بٹن نہیں ہے کہ دبایا اور زندگی آف ہو کر موت آن ہو گئی۔''

''بکواس بند کرو اپنی۔ سمجھے۔ تمہاری بات مان کر میں نے غلطی کی۔ میں مرنا چاہتا ہوں لیکن یہ اندھیرا...... یہ اندھیرا......''

اندھیرے کی چادر پر اس کے گھر کی تصویریں بننے لگی تھیں۔ ماں چاول پھٹک رہی تھیں۔ چھوٹی سہیلیوں کے ساتھ اسٹاپو کھیل رہی تھی۔ آپا بالوں میں مہندی لگا کر دھوپ میں بیٹھی تھیں۔ ابا شہر سے اس کے لیے پتنگیں اور ڈوریں لائے تھے۔ وہ پتنگوں کا تاوا' ڈوروں کی تندی' مانجا چیک کر رہا تھا۔

پھر مانجا لگی ڈور اس کی گردن پر پھر گئی۔ اس نے دلخراش چیخ ماری۔ اسے اسی لیے اندھیرے سے خوف آتا تھا۔ اندھیرا بڑا چالباز اور بہروپیا تھا۔ کبھی ماں جی بن جاتا کبھی ابا جی...... کبھی نومبر کی دھوپ میں ڈھل جاتا کبھی خون میں...... ہر طرف خون میں......

ابراہیم کو سانپ سونگھ گیا......

''مجھے یہاں سے باہر نکال لو۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ میں کل تک نہیں مروں گا۔ میں دو دن تک اندھیرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اس کے یہ وار نہیں سہہ سکتا......''

وہ باقاعدہ گڑگڑانے لگا تھا۔ نمک کی قلمیں اس کے آنسوؤں کی تڑپ پر ایک ایک کر کے گرنے لگیں۔ زمین کی ساری بلندیاں اُوپر رہ گئیں تھیں اور وہ زمین کی تہوں سے لگا تڑپ رہا تھا......

''مجھے باہر جانا ہے۔''

طلال کی سسکی' ابراہیم کے گہرے سانس کے ساتھ جا ملی تھی۔ پہاڑوں کی تہوں کے سناٹوں نے زندگی کے شور کو اجاگر کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کی کھوہ اور غاروں میں لمبے عرصے تک خاموشی رہے تو وہاں پریاں اُترتی ہیں۔ ورنہ جن۔ ورنہ موت کے فرشتے...... یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان جگہوں کی تنہائیوں میں حکمت اترتی ہے...... درویشی...... اللہ سے قربت کے امکان...... الہام اور پیغام......

☆ ☆ ☆

لائٹر وہ پھینک چکا تھا۔ ان کے جسموں سے آدھی جان ویسے ہی نکل چکی تھی۔ ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہوئے' کان سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ تین' چار گھنٹوں میں ہی بالکل آدھ موئے ہو چکے تھے۔ ان میں ایک دوسرے سے بات کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی

تھی۔ انہیں یہ سمجھنے میں بھی وقت نہیں لگا تھا کہ اب وہ اس کان سے مر کر بھی نہیں نکل سکتے۔ انہیں ایسے ہی سسک سسک کر یہیں مرنا ہو گا.....ادھ موئے ہو کر وہ زمین پر گر گئے۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟''

آواز ان کے قریب سے آئی۔ صحرا میں بھٹک جانے والے سیراب کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں جگہ جگہ نخلستان دکھائی دیتے ہیں۔ پانی' آبشار' پھل اور سبز باغ۔ وہ بھی سیراب کا شکار تھے اسی لیے انسانی آواز سن رہے تھے۔

ہادی نے اپنے سر پر ہاتھ کا لمس بھی محسوس کیا۔ ''پیاس لگی ہے؟''

روشنی کی کرن اس کی آنکھ کے قریب آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سفید ڈاڑھی' اور لالٹین کی پیلی روشنی پر اس کی نظر پڑی' جس نے لمحہ بھر کے لیے اسے اندھا کر دیا۔

''یہ لو پانی پیو۔''

وہ بے یقینی سے پانی کی بوتل کو دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے بوتل پکڑ لی۔ اس کے غٹا غٹ پانی پینے کی آواز پر اوندھے منہ گرے طلال نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر ابراہیم نے۔ طلال نے بوتل اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ لالٹین ان کے پاس رکھ کر وہ اور پانی لینے چلے گئے۔

''یہ کھالو.....'' انہوں نے دودھ اور کھجوریں ان کے سامنے رکھ دیں۔ سہارا دے کر وہ تینوں کو اپنی کھوہ تک لے آئے تھے۔

ہادی نے دودھ کے پیالے کو منہ سے لگا لیا۔ طلال' ابراہیم کھجوریں کھانے لگیں۔ چھوٹی سی کھوہ تھی۔ ہر طرف پیال بچھی تھی۔ دیوار سے ایک لالٹین لٹک رہی تھی۔ کونے میں جائے نماز بچھی تھی' جس پر بیٹھ کر بابا جی نے قرآن پاک کھول لیا تھا۔

''یہاں کیا کر رہے تھے؟'' اپنی منزل ختم کر کے' قرآن کو جزدان میں لپیٹتے ہوئے انہوں نے ہادی اور طلال سے پوچھا۔

''مرنے آئے تھے.....'' جواب ابراہیم نے دیا۔

''پھر پانی کیوں پیا.....؟'' نرمی' شفقت اور اطمینان..... مسکراہٹ میں سب کچھ تھا۔

''ایسے تڑپ تڑپ کر نہیں مرنا چاہتا۔'' ہادی کو خود معلوم نہیں تھا کہ پھر پانی کیوں پیا۔ باہر جانے کی تمنا کیوں کی۔

''جب تک انسان زندہ رہے' اسے بس زندہ رہنے کے لیے تڑپنا چاہیے۔''

''مجھے باہر جانا ہے۔'' ان کا پانی' دودھ' کھجوریں کھا کر' ان کا شکریہ ادا کیے بغیر وہ انہیں حکم دے رہا تھا۔

''چلے جانا..... مجھے کچھ وقت دو پھر میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔''

اُٹھ کر وہ مٹی کی صراحی سے پانی نکال کر وضو کرنے لگے۔ ہادی نے بے چینی سے پہلو بدل کر انہیں دیکھا۔

رات کا تیسرا پہر..... اللہ سے کلام کا پہر.....

کعبے کی طرف رخ کر کے وہ اذان دے رہے تھے۔ پہاڑوں کی تہوں کے سناٹے اس آواز پر فدا تھے۔ ہر شے' ہر ساعت' مبہوت

تھی۔ ہر سانس اس باباوے کی حیات میں نمو پانے کے لیے بے قرار تھی......سوائے ان انسان کے......سوائے ان تین کے......

''نماز کے لیے وضو کرلو۔ ایسی جگہوں پر نماز نصیب والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ پھر میں تمہیں باہر لے جاؤں گا۔''

وہ تینوں سمجھ چکے تھے کہ انہیں نماز پڑھنی ہی ہوگی ورنہ وہ انہیں باہر کا راستہ نہیں دکھائیں گے۔ سلام کے بعد انہیں یاد آیا کہ کل اس وقت وہ زندگی کو قضاء کرنے کے لیے نکلے تھے......فجر کے وقت......اور آج اسی وقت وہ نماز فرض ادا کر چکے تھے......

''باہر جانا ہے تو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔'' دعا مانگ کر، آمین کہنے کے بعد انہوں نے مصلی پر بیٹھے بیٹھے ان کی طرف رخ موڑ کر کہا۔

''کہ ہم مرنے کا خیال دل سے نکال دیں۔'' ہادی تلخی سے ہنسا۔

''موت کے خیال کو دل میں رکھو' بلکہ پختہ رکھو......موت بری شے تو نہیں......''

''تو پھر......؟؟'' ہادی نے اپنی ناگواری چھپانے کی ذرا سی کوشش بھی نہیں کی۔

''تو پھر......'' ان کے چہرے کی شفقت معدوم ہونے لگی۔ ''تو پھر یہ کہ میں تمہاری مدد کیوں کروں؟ کس لیے......؟؟''

ہادی گڑبڑا گیا۔ اس نے چور نظروں سے دونوں کو بھی دیکھا۔

''اسے معاف کردیں۔ ہماری مدد کریں پلیز۔'' طلال نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''میں مدد کردوں گا......بدلے میں تم مجھے کیا دو گے؟؟''

تینوں کو سانپ سونگھ گیا۔ ''کیا لیں گے آپ؟'' ابراہیم نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

کچھ دیر تک وہ خاموش رہے۔ پھر کونے سے چمڑے کا ایک تھیلا اٹھا لائے۔

''یہ میرے پاس کسی کی امانت ہے' اگر تم اس تک پہنچا دو تو مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ پھر جو چاہے کرنا۔''

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہادی نے جھجکتے ہوئے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے۔

''ہم آپ کا یہ کام کردیں گے......انشاءاللہ......'' یقین دہانی کروانے میں ابراہیم نے پہل کی تھی۔

☆ ☆ ☆

''آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟؟'' ہادی کھوہ سے نکل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اسے اچانک یاد آیا تو ذرا سا اندر ہو کر پوچھنے لگا۔

''میں اکثر یہاں عبادت کے لیے آتا ہوں......'' وہ لالٹین میں تیل ڈال رہے تھے۔

''یہاں......اتنی دُور......؟؟؟''

''ہاں......اتنی دُور......اللہ کے اتنے قریب......''

ہادی کا دل سکڑ گیا۔ اس کی تہجد گزار ماں بھی کچھ ایسی ہی باتیں کیا کرتی تھی۔

''تہجد کی نمازوں کی توفیق بہت خاص لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔'' ہادی کے قریب آ کر' اس کے شانے پر تھپکی دے کر کہا۔ لالٹین

والا ہاتھ اوپر کیا اور خود آگے ہو کر انہیں اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر تک وہ تنگ راہداریوں سے گزرتے رہے۔ پھر نسبتاً کھلے حصے میں آ گئے۔ ایکدم باباجی نے پلٹ کر لالٹین کی روشنی کا رخ ان تینوں کے چہروں کی طرف موڑ دیا۔ لالٹین ان کے ہاتھ میں جھولنے لگی۔ ان کے چہرے روشنی کے ہالے میں جلنے بجھنے لگے……

''تم میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ یہاں سے باہر جاتے ہی تم کسی بلندی سے کود جاؤ گے اور تم اپنی نبض کاٹ لو گے۔'' وہ ہادی اور طلال سے مخاطب تھے۔

ہادی کے پیر زمین نے جکڑ لیے۔ اس کی سانسوں پر گرہیں لگنے لگیں تھیں۔ طلال تیزی سے ناخن چبانے لگا۔

''م……مم……'' ہادی نے بڑی بے بسی سے باباجی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے پاگل پن پر کڑا وقت آیا تھا۔

''وعدہ کرو مجھ سے……'' کہتے کہتے وہ رک گئے اور گہرا سانس لیا۔ ''انسان کی نیت ہی ٹھیک نہ ہو تو وعدے' حلف' عہد بھی دو کوڑی کے ہو جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت ہی کیا رہتی ہے بھلا……''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا کام کرنے کی پوری کوشش کروں گا……'' ہادی کی زبان اس کی نیت کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''اس امانت کا امانت دار تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ اکیلا یہ سب کر سکوں۔ مجھ پر یہ احسان کر دو……اللہ تم سے خوش ہوگا۔'' لالٹین زمین پر رکھ کر انہوں نے ان کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے……

ابراہیم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ''میں آپ کے اس کام کی تکمیل کا وعدہ کرتا ہوں……''

''شکریہ تمہارا……آؤ میرے ساتھ……'' سر ہلا کر وہ مسکرائے۔

چھوٹے سے پل سے گزر کر انہیں روشنی کی لکیر دکھائی دینے لگی تھی۔ کان کی انتظامیہ کی آوازوں کی بھنبھناہٹ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ تینوں نے بیک وقت گردنیں موڑ کر پیچھے دیکھا اور باباجی کو مسکرا کر ہاتھ ہلاتے ہوئے پایا……

جیسے کوہ پیما آگے پیچھے بلندی کی طرف سفر کرتے ہیں' ویسے ہی وہ آگے پیچھے سفر کر رہے تھے۔ رات گزر چکی تھی۔ دن نکل آیا تھا۔ وہ اس کڑے سفر اور لمبی کان سے باہر نکلے تو ہادی نے سب سے پہلے روشنی کو محسوس کیا……روشنی جو زندگی کی سانس ہے۔ طلال نے کرکٹ کھیلتے' شور شرابا کرتے بچوں کو……بچے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہیں کہ ایک اور نئے جہاں کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ ابراہیم نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف……

آسمان جس کی وسعت گواہ ہے کہ انسان پر اللہ کی رحمت بے حساب ہے……

☆ ☆ ☆

چھوٹی بڑی پہاڑیاں کو دپھاند کر وہ بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ طلال نے پانی کی بوتل سے سر کو گیلا کیا اور بالوں کو جھٹکنے لگا۔ پھر وہ ایک لمبے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ہادی دونوں ٹانگیں پھیلا کر ایک اونچے پہاڑی ٹیلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ چھلانگ لگا کر ابراہیم بھی اس کے پاس جا پہنچا اور ذرا نیچے ہو کر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک تینوں خاموشی سے دُور تک پھیلے پہاڑی سلسلوں کو دیکھتے رہے۔

زبان کے نیچے دونوں انگلیاں پھنسا کر ابراہیم نے پورا زور لگا کر سیٹی ماری۔ اس کی سیٹی کی گونج صبح کی پو کے ساتھ بڑی بھلی لگی۔ نیچے سے ہوٹل کے چھوٹے نے اُوپر انہیں دیکھا۔ اور جلدی سے ان کے لیے تین کپ چائے اور تلوں والے نان لے آیا۔

نان توڑ توڑ کر چائے میں ڈبو ڈبو کر کھاتے' تینوں ٹوٹے پھوٹے بلے کے ساتھ کرکٹ میچ کھیلتے بچوں کو دیکھتے رہے۔ اسکور کرنے کے لیے' میچ جیتنے کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔ ہار کوئی بھی ہو' خاطر میں نہیں لانی چاہیے۔ جیت کوئی بھی ہو سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیے......

جس وقت وہ کار میں بیٹھے' اس وقت ایک چھوٹا سا بچہ نمک سے بنی چیزوں کی ٹوکری کھڑکی کے سامنے لایا اور مسکرا دیا۔

''بچے سے کچھ لے لو یار!'' ابراہیم نے گردن موڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ پہلی بات تھی جو کان سے نکلنے کے بعد اس نے کی تھی۔

ہادی نے ایسے ہی ہاتھ بڑھا دیا' بچے نے اس کی طرف نمک سے بنا ''شاہین'' بڑھا دیا۔ طلال کی سمت ''سفید پھول'' اور ابراہیم کی طرف اپنی مسکراہٹ اور ایک ''خنجر''۔ تینوں نے اپنی اپنی چیزیں غیر ارادی طور پر اپنی اپنی جیبوں میں رکھ لیں......

اور......موت کا سلسلہ......زندگی پانے کے لیے شروع ہو گیا......

☆ ☆ ☆

گوجرانولہ اڈے پر کار روک کر ابراہیم نے چائے کے ہوٹل سے امام دین کے بارے میں پوچھا۔ بابا جی نے کہا تھا کہ اڈے کے ہوٹل سے ہی اتا پتا مل جائے گا۔

''انہیں بھولو کے گھر لے جاؤ'' ہوٹل کے مالک نے چھوٹے کو آواز دے کر کہا۔

''بھولو نہیں امام دین سے ملنا ہے......'' ہادی کی آنکھوں نے چائے پھینٹتے' چائے والے کے ہاتھوں کی ''بلندی'' کا تعاقب کیا۔

''گوجرانولہ میں کسی بھی بندے کا پتا کرنا ہو' بھولو کی حویلی سے ہی نشان ملتا ہے۔ چڑی کے بوٹ اور پہلوان کے لنگوٹ کا بھی۔''

ابراہیم کی ہنسی نکل گئی۔ چھوٹا فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

بازار میں رش بہت تھا' اور وہ ہارن دے دے کر تھک چکا تھا۔ نہ ہی بھیڑ ہارن پر راستہ دے رہی تھی' نہ کھڑکی سے نکلے اس کے ہاتھ کے اشاروں پر۔ (منت سماجت) آدھے گھنٹے سے کار بازار میں پھنسی ہوئی تھی۔

''یار کوئی اور راستہ نہیں تھا وہاں جانے کے لیے......'' ابراہیم نے مستقل ہارن پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ ایک ماں جی نے ونڈ شیلڈ کی طرف ہاتھ سے لعنت کے اشارے اور دو چار دس بارہ گالیاں ارسال کیں تو اس نے ہڑبڑا کر ہارن سے ہاتھ ہٹا لیا۔

لڑکا اپنا سر کھجانے لگا۔ ''تھا تو......پر میں نے سوچا آپ ذرا بازار کی سیر بھی کر لیں گے......نئے ہیں نا اس شہر میں۔''

ہادی نے پیچھے سے بچے کے ریچھ جیسے بالوں کے گچھے میں ہاتھ پھنسا کر کھینچا۔ ''ہمیں سیر کروانی تھی یا خود کرنی تھی......ویسے گھر والے تمہیں کیا کہتے ہیں......بندریا بندر؟؟''

''جی باندر...... پر آپ کو کیسے پتا چلا جی......؟؟''

''تمہاری اس کھجلی سے...... جو پورے جسم میں پھیلی ہوئی اور دونوں ہاتھوں سے کھجانے پر بھی ختم نہیں ہو رہی۔''

وہ کھی کھی ہنسنے لگا۔''بس جی کیا کریں' شکر ہے اللہ کا...... وہ جس حال میں رکھے......''

''پانی گرم کر کے رگڑ رگڑ کر نہانے کے بعد کے حال میں آ کر دیکھو...... ساری مخلوق تمہیں دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرے گی۔''

''یا اللہ تیرا شکر'' ابراہیم نے بروقت بریک پر پاؤں کا دباؤ ڈالا تھا۔ ورنہ سموسے والے کی گرم تیل کی کڑاہی اور آلو چنے والے کی ریڑھی مل ملا کر الٹ جاتیں۔ اور پورے بازار میں کہرام برپا ہو جاتا...... ساری نانیاں دادیاں اسے کوستیں۔

''بڑی اچھی سیر ہو گئی ہماری بازار کی...... شکریہ آپ کا باندر جی!'' اس نے اسٹرنگ پر سر کو گرا لیا اور ترچھی نظر سے چھوٹے کو گھورا۔

''بس جی وہ رہی سامنے حویلی......'' اس نے کمر اور پیٹ کو ایک ساتھ کھجاتے ہوئے کہا۔

''وہ تمہیں بس سامنے نظر آ رہی تھی؟ آنکھوں میں دوربین فٹ ہے؟؟'' طلال نے دور بہت دور حویلی کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر دیکھا۔

''کار سے نکلیں جی...... اڑ کر پہنچ جائیں گے...... آپ نکلیں تو سہی......''

''کیوں کار سے نکلتے ہی ہم راکٹ بن جائیں گے......؟؟'' ہادی نے اس کے بالوں کے گچھے میں ہاتھ ڈالا تھا نا۔ اب وہ ہاتھ آرام سے نہیں بیٹھ رہا تھا...... بازو کھجا رہا تھا......

تینوں راکٹ کار سے نکلے تو چھوٹا تیزی سے پیچھے کی طرف بدکا......

''آگے آپ خود ہی چلے جائیں۔ میری ٹانگوں میں ویسے ہی جان نہیں ہے۔ پچھلی پچاس ڈنڈ بیٹھکیں ابھی رہتی ہیں۔ جرمانے کی ساٹھ الگ سے۔ موٹو گنتی میں بے ایمانی بھی بڑی کرتا ہے۔ نا بابا نا...... تسی جاؤ جی......'' بندر کی طرح چھلانگیں مارتا باندر بازار کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔

لال اینٹوں کی حویلی کا بڑا سیاہ پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ پھاٹک پر ایسے آنا جانا لگا ہوا تھا جیسے اندر رس گلے اور جلیبیاں مفت تقسیم کی جا رہی ہوں۔ لسی' فالودہ' اور ساتھ دس دس کے نوٹ بھی...... پھاٹک کی دو سیڑھیاں چڑھ کر ہادی نے سر اندر کی طرف ترچھا کر کے جھانک کر دیکھا۔ اسے ہلکا سا ایک جھٹکا لگا۔ اس کی پشت سے سر اونچا کر کے ابراہیم نے جھانکا۔ پھر طلال نے جس نے بڑی بے نیازی سے پینٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ دیئے ہوئے تھے۔

اندر بڑا سا...... بہت ہی بڑا سا اکھاڑا تھا اور وہاں دنگل ہو رہا تھا...... مٹی کے میدان میں گوشت کے پہلوان ایک دوسرے کو پٹخ پٹخ کر زمین پر دے دے کر مار رہے تھے۔ آس پاس کچھ بچے' بڑے بوڑھے' کھڑے' بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہنسی ٹھٹھول' مذاق' مذاق رات' سب چل رہا تھا۔ ایک طرف ہر عمر' ہر ساخت' ہر رنگ کے بچے بچیاں ترتیب سے آگے پیچھے کھڑے ڈنڈ بیٹھکیں لگا رہے تھے اور ایک چھوٹا پہلوان نما بچہ ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ کچھ ایسے گنتی گن رہا تھا......

''تاڈے اٹھائیس۔ ساڈے اٹھائیس...... کچا اٹھائیس...... پکا اٹھائیس...... پونا اٹھائیس...... ہون ہویا پورا اٹھائیس۔''

تاڈا پہلوان' ساڈا پہلوان' کچا' پکا' پونا' پورا پہلوان...... انہوں نے زندگی میں بھائی جان تو بہت دیکھے تھے لیکن "پہلوان" پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ وہاں ادھر ادھر' دائیں بائیں' اوپر نیچے' اتنے پہلوان تھے...... اتنے کہ...... کہ ان تینوں کو ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ "انسان لینڈ" سے نکل کر "پہلوان لینڈ" میں آچکے ہیں۔ دنیا میں اب کہیں کوئی انسان باقی نہیں بچا ہوگا...... نہ چاند پر...... نہ مریخ' مشتری' پلوٹو وغیرہ پر۔

"وہ بھولو کہاں ہے؟" قریب سے گزرتے ایک آدمی سے ہادی نے پوچھا۔ تینوں پھاٹک سے اندر آچکے تھے۔

آدمی رکا اور کھینچ کر ایک تھپڑ ہادی کے گال پر رکھا۔

"تیرے ساتھ کھیلتا رہا ہے بھولو...... تیرا "بھالو" ہے بھولو...... اپنے باپ کی عمر کے لوگوں کو ایسے بلاتا ہے تو۔"

اسے کیا پتا تھا کہ وہ اس کی باپ کی عمر کے ہیں......

کچھ چپیڑ اتنی کڑک دار تھی' کچھ آدمی کی آواز ایسی دبنگ دار تھی کہ اکھاڑے کے سارے پہلوان اپنا اپنا کام (مار کٹائی) چھوڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ دیواروں پر بیٹھے سارے کوئیں ایکدم سے اُڑ گئے۔ ڈنڈ بیٹھکیں لگاتے بچے رک گئے' ان کے دانت خواہ مخواہ نکل آئے۔ سارے' تاڑے' کچے' پکے کرتے پہلوان' بے ایمان بچے کی گردن پوری ان کی طرف گھوم گئی۔

پہلوانوں کی بھیڑ میں سے ایک گرج دار آواز گونجی۔ "کون ہیں یہ؟؟؟"

"پتا نہیں پہلوان جی کون ہیں...... کہتے ہیں "بھالو بھولو" کہاں ہے؟ دیکھو ذرا......"

دیکھو ذرا...... حیرت سے ان تینوں کی آنکھیں ساکت ہوگئیں۔ طلال جو دیوار کے سہارے ایک پاؤں ٹکا کر کھڑا تھا' لڑکھڑا کر گرتے گرتے رہا۔ کھڑے کھڑے بھاء چپیڑ نے کیسے جھوٹ گھڑ لیا تھا۔

"بھالو...... بھاء کو بھالو کہا......" یہاں وہاں' ادھر ادھر آگے پیچھے' دائیں بائیں' ہر طرف "بھالو بھالو" ہوگیا۔

"لاؤ اوے ذرا انہیں ادھر...... کھوتے اوتوں کھلوتے......"

جو تھوڑا بہت شور شرابا تھا بھی وہ اس آواز کے بلند ہوتے ہی کنویں کی تہہ ہوگیا۔ کھلوتے کھوتے ذرا سا سہم گئے۔ ادھر آؤ کی بجائے بھولو نے کہا تھا۔ "لاؤ انہیں ادھر"۔ ابراہیم معذرت کرنا ہی چاہتا تھا کہ کوئی تین چار' دس بارہ ہاتھ' ادھر اُدھر سے آئے اور جیسے ہینگر میں کپڑے ہنگ ہوتے ہیں' ویسے انہیں اپنے بازوؤں میں ہینگ کر کے "بھولو" کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

"کیا کہا مجھے؟؟؟" لکڑی کی کرسی پر کمر سیدھی رکھ کر بیٹھے "بھولو" نے سینے پر ہاتھ باندھ کر پوچھا۔

"مجھے پتا نہیں تھا آپ پہلوان ہیں......" سب سے آگے ابراہیم ہی کھڑا ہوا تھا۔ سانس بھی اس کا ہی خشک ہو رہا تھا۔

"جو پہلوان نہیں ہوگا اس کی عزت نہیں کرو گے؟" وہ ابراہیم کی پشت کا سہارا لینے والے ہادی سے پوچھ رہے تھے۔

"سوری! پتا نہیں تھا کہ آپ عمر میں بڑے ہیں......" ہادی نے سر کو کھجایا پھر کان کو...... پھر ٹھوڑی کو...... باندر اپنی بیماری' پوری ایمان داری سے اسے عطیہ کر گیا تھا...... وہ بھی مفتوں مفتی......

''جو عمر میں چھوٹا ہو گا اسے بے عزت کرو گے؟؟''

ہادی کا سر چکرا گیا۔''وہ دراصل ہمیں امام دین سے ملنا ہے......'' طلال نے اپنی طرف سے بات کو سنبھالنا چاہا......

''امام دین تیرا یار ہے؟؟؟ چاچا وچاچا ساتھ لگاتے موت پڑتی ہے۔''بات سنبھل گئی......کھری کھری سننے کے لیے مل گئیں۔

''ہمیں چاچا امام دین سے ملنا تھا۔''

تینوں ہی گھبرا' گھگھیا' ہتھلا گئے۔ سارا ہجوم ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ بھولو پہلوان کی بات پر سارا مجمع بیک وقت سر کو''ہاں''میں ہلاتا تھا۔ ان کے جواب پر سر گھما کر انہیں گھورتا تھا......یہ تو کھلا تضاد ہوا......

''چاچے سے بھی مل لینا' پہلے اپنے مامے سے ملو......بھالو مامے سے......''بھالو مامے نے اپنی بانہیں ان کی طرف پھیلا دیں۔ پیچھے سے کسی پہلوان نے ایویں کہنی سے ٹھونگا مارا اور وہ باری باری کرسی پر بیٹھے''بھالو مامے''کے سینے سے جا لگے......

زندگی میں کچھ واقعات پہلی بار ہوتے ہیں اور بڑے اندوہناک ہوتے ہیں......آسمانی بجلی کا گرنا' سونامی طوفان کا آنا' پہاڑ کی چوٹی سے گر جانا......اور پھر پہلوان کے سینے سے جا لگنا......

ایک ہوتا ہے چولیں ہل جانا اور ایک ہوتا ہے' جو کچھ تھا سب کا ہل ہلا جانا۔ ان کے ساتھ یہ دونوں واقعات وحادثات ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

تینوں بیٹھ گئے بلکہ بٹھا دیئے گئے۔ ہادی بھاء بھولو کے کے دائیں' طلال بائیں اور ابراہیم ذرا سا دُور ہٹ (بچ) کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گلے لگنے کی صورت ہڈیوں کا کچومر بنوالیا تھا' اب وہ ان پر کالا نمک نہیں چھڑکوانا چاہتا تھا۔ احتیاط مارے سے بہتر ہوتی ہے۔

''کشتیاں دیکھی ہے کبھی؟'' بھاء بھولو نے ہادی اور طلال کے شانے پر اپنا ایک ایک ہاتھ (ہتھوڑا) رکھتے (مارتے) ہوئے پوچھا۔ ہاتھ پہلوان کا' اور سوال جان کا۔ دونوں نے آہ دبا کر' ناں میں گردن ہلا دی۔

''اب دیکھو......چلو میرے پہلوان بچوں شروع ہو جاؤ۔''

پہلوان بچوں نے رکا ہوا دنگل پھر سے شروع کر دیا۔ کوئی تیس' چالیس کے قریب پہلوان کھڑے تھے' جو ایک ایک کر کے کشتی لڑنے لگے تھے۔ ان کے لیے اندر سے لسی کے گلاس (بالٹیاں) آنے لگیں۔ پھر پیڑے' پھر دُودھ جلیبی......پھر......پھر......

وہ ایک عرصے سے دوائیوں پر زندہ تھے۔ ان کے جسم نارمل نہیں رہے تھے۔ وہ تھوڑا بہت' یا زیادہ کچھ بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ ان کے معدے ناتواں ہو چکے تھے۔ ہادی کھاتا جا رہا تھا' اور ابکائیاں کرتا جا رہا تھا۔ بھاء پھر بھی باز نہیں آ رہا تھا۔ انہیں زبردستی کھلاتا جا رہا تھا۔ نالسی ختم ہونے میں آ رہی تھی نا کشتی۔

''رستم زماں غلام محمد گاما پہلوان کو جانتے ہو نا......یہ نہ کہنا کہ نہیں جانتے' ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔''

برا ہوا کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے......انہیں ضرورت ہی کیا پڑی تھی' اپنے علاوہ کسی اور کی خبر رکھنے کی۔

''تم نئے زمانے کے لوگ' اپنے ہیرووں کے بارے میں جان کر کرو گے ہی کیا۔ بروس لی کو تو جانتے ہی ہو گے' جس کے نام کا ڈنکا

آج بھی چار عالم میں بجتا ہے۔ وہ بروس لی ہمارے رستم زماں گاماں پہلوان کا بہت بڑا مداح تھا۔ اپنا استاد مانتا تھا رستم زماں کو۔ ان جیسی ورزشیں کرتا تھا۔ بہت کچھ سیکھا تھا اس نے ان سے۔ اب کچھ قدر ہوئی تمہاری نظر میں بھاء گاماں کی؟''

تینوں شرمندگی سے نظریں چرانے لگے۔

''بائیس سال کی عمر میں رستم زماں بھاء گاماں نے بارہ سو کلو وزنی پتھر اٹھا کر' سینے تک لا کر' چند قدم چل کر ساری دنیا کو حیرت سے بت بنا دیا تھا۔ یہ پتھر آج بھی انڈیا کے میوزم میں رکھا ہوا ہے۔ بارہ سو کلو جانتے ہو کتنا ہوتا ہے؟''

طلال نے سر ہلا دیا...... ''تیس' بتیس آدمی مل کر اٹھائیں تو شاید اٹھایا جائے...... ورنہ کوئی کرین وغیرہ......''

بھاء نے سر ہلایا اور سارے مجمع کی طرف دیکھا۔ ''انسان کے جسم میں اتنی طاقت ہے تو روح میں کتنی ہوگی؟ کیونکہ روح جسم سے افضل ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا غم اور تکلیف سہہ جاتی ہے۔ تو بس روح کو افضل رکھو...... روح کی طاقت ہی اصل طاقت ہوتی ہے۔ حقیقی پہلوان' پہلوانی داؤ' اور درویشی صفت سے جیتتا ہے۔ جس کی روح افضل ہے' اسے کوئی نہیں ہرا سکتا۔ سمجھ گئے سب؟؟''

سب نے بیک وقت ''سمجھ گئے جی......'' کا نعرہ بلند کیا۔

لمبے برآمدے سے گزر کر وہ حویلی کے سرخ اینٹوں والے کھلے احاطے میں آ کر بیٹھ گئے۔ تخت پر نیم دراز ہو کر بھاء نے اپنے دونوں بازو ہادی اور طلال کی طرف بڑھا دیئے۔

''اکڑ گئے ہیں...... ذرا دم لگا کر دبانا......''

''وہ جی امام دین' میرا مطلب چاچا امام دین......'' ہادی نے ابرو اچکا کر ابراہیم کی طرف سوالیہ دیکھا تو ابراہیم نے سوال کر دیا۔

''آجاتے ہیں وہ بھی۔ ہمارے ہی مہمان ہیں چاچے ہوری۔ اوئے کاکے ہادی! انسان بن' ذرا جان لگا یار!''

''ٹھیک ہے پھر آپ ان کی یہ امانت انہیں دے دیں۔ ہم چلتے ہیں۔'' ابراہیم نے چھرے کا تھیلا بھاء کی طرف بڑھا دیا۔

''میں تمہارا میزبان ہوں' تمہارا کمین نہیں۔ خود دینا امام دین کو۔''

''کب تک آجائیں گے وہ......؟؟''

''آجائے گا...... آجائے گا...... مجھے ذرا اونگھ آرہی ہے...... سو جاؤں تو مغرب کے وقت اٹھا دینا......''

ہادی نے جھٹکے سے بھاء کے بازو کو چھوڑا۔ ''ٹھیک ہے پھر ابھی ہم چلتے ہیں......''

بھاء بھولو نے ایک نظر اسے دیکھا۔ ''تم شراب پیتے ہو؟؟؟ یہ آنکھوں میں لال ڈورے کیسے ہیں؟''

''آپ کو اس سے کیا مطلب؟'' اب وہ غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بدلحاظ اور بے ادب۔

''پتر جی! اپنے خون کی گرمی' یہاں سرد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے؟ میری ساری حویلی بھاں بھاں کریں نا تو بھی آٹھ دس پہلوان یہاں وہاں سے ایویں ہی نکل آتے ہیں۔ ایسے پٹخ پٹخ کر ماریں گے کہ......''

''اچھا ہیں ماریں' جان سے ہی ماردیں۔ بلائیں اپنے پہلوانوں کو۔ بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔'' ہادی کا دوبدو جواب دینا اور

انگارہ لہجہ بھاءکو بہت برا لگا۔

''یہ مہربانی میں تم پر ضرور کروں گا۔ او چیرے، اوئے مکھن! ادھر آؤ ذرا۔ لے جاؤ اس کاکے کو اور اسے مہربان ہو کر دکھاؤ۔''

چیرا، مکھن، ملائی، لسی، دودھ، انڈا، پراٹھا سب نکل آئے۔ اسے اٹھا کر لے گئے اور اکھاڑے میں پٹخ کر پھینکا۔ ابراہیم نے لاکھ معافی تلافی کی لیکن بھاءنے آواز لگا دی......

''رگڑ رگڑ کر رکھ دو اسے......سارے کس بل نکال دو، کوئی پیچ ڈھیلا نہ رہے......''

ڈھیلے پیچ کسنے کے لیے پیچ کسوں نے اسے دونوں پیروں سے پکڑ کر الٹا کر دیا اور گول گول گھمانے لگے۔ ابراہیم نے سہم کر بھاءکی طرف دیکھا۔ پر بھاءآنکھیں موند چکے تھے۔ طلال شرافت سے بھاءکے بازو دبانے میں مصروف ہو چکا تھا۔ دوسرا بازو اب ابراہیم کے حصے میں آچکا تھا۔ وہ بھی چپ چاپ دبانے لگا اور دُور سامنے اکھاڑے کو نظریں چرا چرا کر دیکھنے لگا۔ اتنے پہلوان اور اکیلا ہادی......جیسے نہر کنارے کپڑے دھونے والیاں، کپڑوں کو دے دے کر مارتی ہیں۔ پھر تھاپے سے کوٹتی ہیں۔ وہی سلوک پہلوان ہادی کے ساتھ کر رہے تھے۔ تھاپے کا کام وہ ہاتھوں اور ٹانگوں سے لے رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے ''کشتیاں'' دیکھی تھیں۔ اب وہ ''دھینگا مشتیاں'' دیکھ رہے تھے۔

جب انہیں یقین ہو گیا کہ کپڑا دھل کر صاف ہو گیا ہے۔ ساری میل کچیل نکل گئی ہے۔ کپڑا نچڑ بھی گیا ہے تو وہ اکھاڑے سے سرادھر بھاءکی طرف کر کے پوچھنے لگے......''بس بھاءجی؟''

کیسے ظالم انسان تھے۔ ساڈے، تاڈے، کچے، پکے، آدھے پونے، پورے کس بل نکال کر بھی پوچھ رہے تھے ''بس؟''

بس ہی ہو گئی تھی۔ ابراہیم ہادی کی طرف آنے لگا تو آنکھیں موندے پڑے بھاءنے ابراہیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''سیانوں کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتے۔ پڑا رہنے دو اسے مٹی میں......''

وہ مٹی میں پڑا رہا۔ جب وہ چھوٹا تھا تو مٹی کے گھوگھوگھوڑے بناتے بناتے ان ہی کے ساتھ سو جایا کرتا تھا۔ آنکھ کھلتی تو اوپر درخت کی چھاؤں ہوتی اور نیچے سر ماں کی گود میں......

''پتر چارپائی پر سویا کر......''

''گھوگھوگھوڑے کہتے ہیں کہ انہیں چارپائی پر نیند نہیں آتی......'' وہ کچی پکی نیند میں آنکھیں جھپک جھپک کر ماں کو دیکھتا۔ ہاتھ بڑھا کر ماں کے گال کی چٹکی بھرتا......''سوہنی ماں......''

''شیر پتر......سو جا شاباش......سو جا......'' وہ پیشانی چومتی، سر تھپکتی، لوری گاتی۔

نہ لوری تھی، نہ تھپکی، نہ ماں اور نہ اس کا دلار۔ آنسو اس کی آنکھ سے نکلے اور وہ غنودگی سے گہری نیند میں چلا گیا۔ وہ تو سو گیا لیکن آنسو نہیں سوئے۔ وہ اس کے گالوں پر بہتے رہے......بہتے رہے......

مائیں نی میں کنوں آکھاں......درد وچھوڑے دا حال......

دردو چھوڑے دا حال...... تیرے بعد اس جند دا حال......

☆ ☆ ☆

نیند کا تعلق جسم سے ہے' اور لاعلمی کا روح سے......

جو سوتے رہ جاتے ہیں' وہ کھوتے نہیں' ''کھو'' جاتے ہیں۔ (گم ہو جاتے ہیں)

ان دونوں کی چارپائیاں بھاء کے دائیں بائیں تھیں۔ یہاں وہاں ہر طرف پہلوان ہی پہلوان سو رہے تھے۔ طلال کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے ساتھ اپنی دوا لے کر نہیں آیا تھا۔ جب وہ نکلے ہی مرنے کے لیے تھے تو دوا ساتھ کیوں رکھتے۔ اب اس کے دماغ کا بیمار حصہ پھر سے جاگ رہا تھا اور ڈیپریشن اس پر حملہ کر رہا تھا۔

''سو جا پتر! سو جا......'' اس کے سینے پر ہاتھ آیا اور بھاء تھپکیاں دینے لگے۔

''میں ذرا باہر سے تازہ ہوا کھا کر آیا......'' وہ بے چینی سے اٹھ کر جانے لگا۔

''تجھے تازہ ہوا کی نہیں تازہ ایمان کی ضرورت ہے۔ اللہ سے شکوے شکایتیں کرو تو بھی ٹھیک ہے' کوئی تعلق تو بنا رہتا ہے۔ پر ایسے تعلق توڑ دینا ٹھیک نہیں ہوتا جی! اللہ کی زات پر یقین رکھنا سیکھو۔ جان کو ایک تکلیف ملتی ہے تو سو سکھ بھی تو ملتے ہیں۔''

طلال ان باتوں کو سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے پھر سے اٹھنے کی کوشش کی تو بھاء نے اس کے سینے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔

''چیرے اُٹھ ذرا!''

بھاء نے ہلکی سی آواز دی تھی' جو یقیناً چیرے نے خواب میں سنی ہو گی۔ اور فوراً حاضر جناب ہو کر بھاء کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بھاء نے ہاتھ کا اشارہ طلال کی طرف کیا......بس......ابراہیم نے کن اکھیوں سے دونوں کو دیکھا۔ اشارے پر ہی چیرا کود کر طلال کے سرہانے بیٹھ گیا اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اسے چارپائی پر الٹ کر رکھ دیا......

''یہ...... یہ کیا......'' طلال کی گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

چیرا شاید اب بہرا ہو چکا تھا۔ کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ اس کی کمر' اور ریڑھ کی ہڈی پر چھوٹے مکے (بم) مار رہا تھا۔ اس کے مکوں کی رفتار اور ترتیب میں اتنا توازن تھا کہ طلال کچھ بولتا تو اس کی آواز مکوں کی بمباری میں دب جاتی۔ اس نے ریڑھ کی ہڈی سے لے کر سر تک اسے اچھا خاصا رگڑ کر رکھ دیا تھا۔

''سیانے کہتے ہیں کہ ریڑھ کی ہڈی میں نقص پڑ جائے تو سارے جسم میں نقص پڑ جاتا ہے۔ جس نے ریڑھ کے مہروں کو ٹھیک رکھا' اس نے سب ٹھیک رکھا۔ اب جا کے سو جا چیرے......'' بند آنکھوں سے بھاء نے کہا۔ پھر جھک کر طلال کے منہ پر تین پھونکیں ماریں

''میں نے نیند کا دم بھی کر دیا ہے...... تسی وی سو جاؤ ہن......''

''نیند کا دم...... ہونہہ......'' وہ بڑبڑایا۔

اسے آسمان کے ستارے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہاسپٹل کا اسٹاف اسے نیند کے لیے بہت ہیوی میڈیسن دیا کرتا تھا پھر بھی

اسے نیند نہیں آتی تھی۔ایک بار وہ مسلسل چھ دنوں تک جاگتا رہا تھا۔ڈاکٹرز کا بورڈ ہنگامی میٹنگ کے لیے بیٹھ گیا تھا کہ اگر وہ اب بھی نہیں سویا تو مر جائے گا......اور یہ پہلوانی داؤ......یہ نیند کا دم......یہ......یہ......

آسمان کے ستارے گڈمڈ ہونے لگے تھے......آنکھ مچولی کھیلتے' کودتے پھاندتے' دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب دُور نکل گئے تھے......

☆ ☆ ☆

پتا نہیں کیا ہوا' تینوں ایکدم سے زمین پر آ کر گرے۔کتنی ہی دیر تک وہ ناسمجھی سے سر اٹھا کر اپنے سر پر کھڑے جنوں کو دیکھتے رہے......

''ہم کہاں ہیں......تم کون ہو......؟؟''انہیں کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔

''تم اکھاڑے میں ہو......اور ہم پہلوان ہیں......''

''آہ......''انہیں سب یاد آ گیا تھا۔

وہ مہمان تھے تو وہ ان سے نرمی سے پیش آتے رہے تھے۔انہیں آوازیں دینے' ہلانے جلانے کے بعد وہ ان کے سرہانے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔چارپائیوں کو پکڑ کر کھڑا کر دیا تھا اور انہیں زمین پر الٹ دیا تھا......پکی اینٹوں کے فرش کی زمین پر......

رات کے کسی پہر ہادی کو بھی کسی پہلوان نے آٹے کی بوری کی طرح کندھے پر لاد کر چارپائی پر پٹخ دیا تھا۔اب وہ تینوں چوٹ لگے بچوں کی طرح زمین پر ڈھیر تھے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے......؟؟''ابراہیم نے غصہ دکھانے کی کمزور سی کوشش کی۔

''تمیز سے منہ ہاتھ دھو کر اکھاڑے میں آ جاؤ......''

''اپنے مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہو؟ آدھی رات کو چارپائیاں الٹ دیتے ہو......؟؟''

''آدھی رات نہیں تہجد کا وقت ہونے والا ہے......اُٹھ کر اپنے کام نپٹاؤ......''

ہادی نے بے یقینی سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔''کام......کون سے کام......ہمارے یہاں کون سے کام ہیں بھلا؟؟''

ڈنڈ بیٹھک......ڈنر پیل......دوڑ اور کسرت کے کام......لیکن اس سے پہلے' اکھاڑے کی مٹی کھودنے کا کام......

ان تینوں کو ایک ایک بیلچہ دے دیا گیا اور اکھاڑے کی چکنی مٹی کھودنے پر لگا دیا گیا۔پہلوانوں کی کشتیوں کی وجہ سے چکنی مٹی جم جایا کرتی تھی' روز اس وقت اسے کھودنا پڑتا تھا۔ان تینوں کو اندازہ نہیں تھا کہ پہلوان کا مہمان بن کر انہیں ایسی ایسی قیمتیں (ذلتیں) چکانی پڑیں گی۔

پانچ منٹ بعد ہانپ کر ہادی نے بیلچہ نیچے دے مارا۔''لیکن ہم یہ کیوں کریں......؟؟''

''بھاء کہتے ہیں جو بس سوال ہی کرتا رہ جاتا ہے' وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔جو سر جھکا کر مان لیتا ہے' وہ پار ہو جاتا ہے......''ان کی نگرانی کرنے والے پہلوان نے ہادی کی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا اور جھک کر اسے بیلچہ اٹھا کر دیا۔

''ایک تو ان سب کو باتیں بڑی بنانی آتی ہیں۔'' ہادی نے ایک گہرا سانس لیا۔

دیکھنے میں جو کام جتنا آسان نظر آتا ہے' کرنے میں وہ اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہ چکنی مٹی' ان کی جان پر چکنے پہاڑ کی طرح وزنی ثابت ہو رہی تھی۔ نہ وہ اپنی جگہ سے کھسک رہی تھی' نہ یہ اسے کھسکا پا رہے تھے۔ تینوں بری طرح سے ہانپ رہے تھے۔ سامنے سارے پہلوان تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے......

''حقیقی پہلوان' تہجد سے پہلے اٹھتا ہے اور تہجد کی نماز پڑھتا ہے۔ حقیقی پہلوان کو اسی وقت اصل طاقت نصیب ہوتی ہے' جب وہ حقیقی طاقت وار کو پہچان لیتا ہے۔ جب وہ اپنا سارا تن اور پورا من خدا کے حضور جھکا دیتا ہے۔'' دعا کے بعد بھاء نے بلند آواز سے کہا۔

تہجد کا وقت...... رات کا سب سے محبوب پہر......

اس پہر سے پہلوان کبھی غافل نہیں رہتا...... رہ جائے تو وہ پہلوان نہیں رہتا......

☆ ☆ ☆

تہجد کے بعد وہ اکھاڑے میں اتر آئے اور ڈنڈ بیٹھکیں' ڈنڑ پیلیں ہونے لگیں۔ وہ کیسے بچ رہ سکتے تھے۔ ہادی کو یاد آیا کہ اسے مرض کھجلی عطیہ کرنے والا چھوٹا ڈنڈ بیٹھکوں سے بدک کر بھاگ گیا تھا۔ کوئی مذاق تھا ڈنڈ بیٹھکیں لگانا۔ بیس ڈنڈ بیٹھکوں کے بعد وہ بھی بدک گیا۔

''اور نہیں لگانی مجھے...... چھوڑ دیں بس مجھے...... میرا باپ بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے......'' وہ ضدی' اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''باپ ایک ہی ہوتا ہے...... کوئی اور بننے کی کوشش کرے تو اس کا منہ توڑ دینا چاہیے۔''

ان سب کی نگرانی کرتے بھاء نے دبنگ کہا اور اشارہ کیا۔ دو پہلوان آگے بڑھے' دائیں بائیں شانوں سے پکڑا' ایک پشت پر کھڑا ہو گیا۔ تینوں مل ملا کر اس کی ڈنڈ بیٹھکیں لگوانے لگے......

''ایک...... سوا ایک...... آدھا ایک...... پونا ایک...... چاچا ایک...... ماما ایک...... لو ہو گیا پورا ایک......''

حویلی کے جھرکوں سے نسوانی قہقہے سنائی دیے۔ یہ تو شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ وہ خجل ہو گیا۔

فجر کی نماز کے بعد وہ سب دوڑ لگانے' کسرت کرنے لگے۔ ابراہیم موقع شناس تھا۔ کچھ عقل طلال کی بھی کام کر رہی تھی۔ دونوں کو اچھی طرح سے اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کا حکم مانے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اتنی ساری فوج کی موجودگی میں وہ حویلی سے بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن ہادی کی عقل نے ابھی ٹھیک سے کام کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ ڈنڑ پیل وغیرہ سے ہی تھک کر چور ہو چکا تھا۔ دوڑ کے لیے اکڑ کر کھڑا رہا......

کھڑا رہا...... کھڑا رہا...... کہ ایک پہلوان آیا' اس کی دونوں ہتھیلیوں کو اکٹھا جوڑ کر کلائیوں میں کلک کی آواز کے ساتھ ہتھکڑی جیسا بینڈ فٹ کیا۔ نا سمجھی سے اس نے پہلوان کو دیکھا ہی تھا کہ اس بینڈ کے ساتھ آ کر ایک زنجیر منسلک ہو گئی۔ زنجیر جس کا آخری سرا پٹہ کی صورت کتے کے گلے میں فٹ تھا...... کتوں میں کتا'' خونخوار کتا''......

پہلوان نے سیٹی ماری اور کتا...... کتا صرف کتا نہ رہا‘ ہوائی مخلوق بن گیا۔ یہ جا وہ جا...... پہلے جھٹکے میں ہادی منہ کے بل گرا۔ ناک منہ سے خون نکلا لیکن کتا نہیں رکا۔ ویسے بھی کتوں کا خون سے کیا لینا دینا۔ وہ کرین مشین کی طرح اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا رہا...... گھسٹتا رہا تھا...... دوسرے چکر میں وہ گرتے پڑتے دوڑنے لگا۔ کتا اسے سانس لینے کا موقعہ ہی نہیں دے رہا تھا۔ اب یہ اس کی مرضی تھی کہ وہ زمین پر رگڑ کھا کر‘ گر کر‘ گھسیٹ کر بھاگنا چاہتا تھا یا کھڑا ہو کر دوڑ کر...... اس نے دوڑ کر ذلیل ہونا مناسب سمجھا۔ تیسرے چکر میں اس کا سینہ پھٹ جانے کے قریب ہو گیا۔ چوتھے چکر میں‘ ساری دنیا‘ چرند پرند‘ گھومتے گھومتے رک گئے‘ صرف وہ اکیلا گھومتا رہا...... پانچویں چکر میں اس کا اور کتے کا تیل میل بیٹھ گیا۔ اسے دوڑنے میں مزا آنے لگا۔ چرند پرند‘ زمین آسمان‘ سب اپنی اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ چھٹے چکر میں وہ اپنے گاؤں پہنچ گیا...... اپنے کھیتوں کے اطراف بھاگنے لگا...... ابا کی آواز سننے لگا......

’’شاوا میرے شیر! شاوا...... اک چکر ہور...... اک چکر ہور...... بس اک ہور......‘‘

ساتویں چکر میں اسے کھیتوں کی پگڈنڈیاں پر کودتیں پھاندتیں آپا‘ زینب اور سحرا اپنی طرف آتی دکھائی دیں۔

’’ہاں جی ڈڈو صاب! کیسی چل رہی ہے فوجی ٹریننگ۔ ہی ہی ہی! چلو چلو بھاگو شاباش...... ایویں کہیں گر گرا نہ جانا۔ گاؤں کی لڑکیاں چھپ کر تمہیں دیکھ رہی ہیں‘ ہماری ناک نہ کٹوا دینا......‘‘

گاؤں کی کون کون سی لڑکی اسے چھپ کر دیکھ رہی ہے‘ یہ دیکھنے کے لیے وہ رکا اور توازن بگڑنے پر گر گیا۔

’’ہی ہی ہی! شوخا تے نکما شیر! تھوڑا الوفر تے لفنگا وی...... گاؤں کی لڑکیاں اتنی فارغ نہیں ہیں جو تمہیں دیکھنے کے لیے مری جائیں......‘‘

’’ہائے ماں...... تیرا لال مر گیا ماں......‘‘

ماں کا لال زمین پر گر کر ہانپنے لگا تھا۔ کتوں میں کتا خونخوار کتا اب اسے ہمدردی سے دیکھ رہا تھا۔

’’ناشتہ تیار ہے جی...... آ جاؤ سب......‘‘ پہلوان بچے نے پہلوانوں کو دیکھ کر اعلان کیا اور گرے ہوئے ہادی کو دیکھ کر ’’چچ‘ چچ‘‘۔

ناشتے کے لیے ہادی اور طلال کو بھاء بھولو نے خاص طور پر اپنے ساتھ بٹھایا تھا۔ ابراہیم ڈٹ کر کھا رہا تھا۔ وہ باکسر رہا تھا‘ اسے تو جنوں بھوتوں والی بھوک لگا کرتی تھی۔ پانچ انگلیوں کا مکا بنا کر سامنے والے کو ’’مکا‘‘ ہی دینا آسان نہیں ہوتا۔ ’’بکرے‘ دبنے‘ پایوں کا سالن تھا۔ لسی‘ دیسی گھی کے انڈے پراٹھے۔ بھاء بوٹی بوٹی توڑ کر ان کی طرف بڑھا رہے تھے۔

’’کھاؤ کھاؤ شاباش! رزق حلال ہو‘ اور جسم میں خیر ہو...... شکر یہ یا الٰہی......‘‘

پھر بھاء نے مبخ والی ہڈی لی اور ہادی کا منہ ٹھوڑی سے پکڑ کر کھولا۔ ہڈی کے کنارے پر ہتھیلی سے ضرب مار کر مبخ ہادی کے حلق میں اتار دی......

’’سوکھے ہوئے دماغ کو تر کرتی ہے یہ مبخ۔ بات بات پر بہت بھڑکتے ہو تم۔ اب ٹھیک ہو جاؤ گے انشا اللہ۔ اسے مبخ والی ہڈیاں دو نکال نکال کر۔‘‘

بھاء کے کہنے کی دیر تھی' دسترخوان پر جتنے پہلوان بیٹھے تھے سب مینخ والی ہڈی' بوٹی نکال نکال کر اس کی پلیٹ میں رکھنے لگے۔ بھاء ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر منہ کھولتے جاتے اور ہتھیلی کی ضرب سے مینخ اس کے حلق میں اتارتے جاتے۔

''بس بس! میرا دماغ' دل گردے' پھیپھڑے' بال و پر سب تر ہو گئے ہیں۔'' ہادی نے انکار میں ہاتھ بھی ہلائے اور پورا جسم بھی۔ پر......

''سیانے کہتے ہیں بڑے کھانے کے لیے زہر بھی دیں تو کھا لینا چاہیے۔ ایسے ہاتھ پیر نہیں مارنے چاہیے۔''

ہاتھ پیر مارنے کی گنجائش ہی نہیں بچی تھی۔ آس پاس' آگے پیچھے' سب پہلوان غیر محسوس اسے دبا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تو ایک انچ نہیں ہل سکتا تھا۔ ہاں پر بے چارا بڑی بے چارگی سے ابراہیم کو دیکھ رہا تھا کہ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ اس کی بے چارگی دیکھی ان دیکھی کر کے ابراہیم سر جھکا کر دبنے کے ساتھ انصاف کرنے لگا۔ کیونکہ سیانے یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے ورنہ اپنی گردن پھنس جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

''وہ چاچا امام دین؟'' ان تینوں نے تقریباً اکڑ بکڑ کر کے طلال کو بھاء کے پاس جواب لینے کے لیے بھیجا تھا۔

''کہہ کر گیا تھا ایک دو دن میں آ جاؤں گا۔ ابھی تک آیا نہیں۔''

''پھر آپ ان کی امانت رکھ لیں اور ہمیں اجازت دیں......'' طلال بھاء سے کافی فاصلہ رکھ کر کھڑا تھا...... احتیاطاً......

''کیا پتا وہ سال' چھ مہینے تک دوبارہ یہاں کا چکر لگائے ہی نا...... امانت کا بہت بوجھ ہوتا ہے جی......''

''تو پھر......؟'' ایک تو طلال سے بھاء کے سامنے بولا ہی نہیں جاتا تھا۔

''تو پھر اس کی امانت اپنے پاس رکھو۔ میں ایک دو بندے بھیجتا ہوں' ایک دو ٹھکانے اور ہیں امام دین کے۔ شاید کوئی اتا پتا مل جائے۔''

طلال نے آ کر ان دونوں کو سب بتا دیا۔

''دو دن اور دیکھ لیں؟'' ابراہیم دونوں سے پوچھ رہا تھا۔

''لیکن میں اور ڈنڈ بیٹھکیں نہیں لگاؤں گا اور دوڑ بھی۔'' وہ بدک کر کھڑا ہوا اور کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ نیچے پہلوان بچہ ''تڑک پہلوانی'' کی گنتی گن کر جہانگیری بچوں کی جان ہلکان کر رہا تھا۔ اس نے دانت پیس کر اسے گھور کر دیکھا تو بچے کی چھٹی ساتویں حس نے بیدار ہو کر اسے سر اٹھا کر اوپر دیکھنے کی تلقین کی۔ اس نے سر اٹھایا اور ہادی کو گھورتے پایا......

''آ جائیں بھاء جی آپ بھی...... ڈنڈ بیٹھک کی تھوڑی اور پریکٹس کروا دوں آپ کو جی......'' وہ بڑے خلوص سے مسکرایا۔

''پہلے اپنی گنتی ٹھیک کر موٹو' پھر مجھے ''پریکٹس'' کروانا......'' ہادی نے جل کر کہا۔

''بہت بھولے ہو جی آپ......'' موٹو قہقہے لگانے لگا۔

''اور تو پورا بدمعاش ہے۔'' ہادی معصوم سے پہلوان بچے سے باقاعدہ لڑ رہا تھا۔ ابراہیم نے خائف ہو کر اسے دیکھا۔

''پھر اسی شہر میں کہیں اور رہ لیتے ہیں۔ یہاں سے چلے جاتے ہیں۔''

ابراہیم نے مسئلے کا آخری حل پیش کیا' جسے سب نے منظور کر لیا۔ وہ بھاء کو خدا حافظ کہنے کے لیے آ گئے۔ ساتھ یہ بتانے لگے کہ وہ چند دنوں بعد آ کر چاچا امام دین کا اتا پتا معلوم کر لیں گے۔ ابھی فی الحال وہ یہاں سے جا رہے ہیں۔

''میری مہمان نوازی میں کوئی کسر رہ گئی ہے کیا؟'' بھاء نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''کسریں نکال دی ہیں آپ نے ان کی جناب!'' جس نے پہلے دن ہادی کو چپیڑ ماری تھی' وہ کہہ کر کھی کھی ہنسنے لگا۔

''مہمان ایسے گھر چھوڑ کر جائے تو میزبان کی بڑی بے عزتی ہوتی ہے۔ جی۔'' بھاء نے معصومیت پر بے چارگی بھی طاری کر لی۔

''دراصل یہ ڈنڈ بیٹھکیں' ڈنر پیل وغیرہ نہیں کرنا چاہتے۔ آپ زبردستی بھی تو بہت کرتے ہیں۔'' ابراہیم نے کہا تو نارمل انداز سے تھا لیکن اس کے لہجے سے آگ پر تیل چھڑکنے کی بو آ رہی تھی۔

''اب کوئی ڈنڈ بیٹھک وغیرہ نہیں ہو گی...... بس خوش......؟؟'' بھاء نے وعدہ دینے والے انداز سے ہاتھ اٹھایا۔

پھر واقعی کوئی ڈنڈ بیٹھک نہیں ہوئی تھی۔ ہو جاتی تو اچھا تھا' کیونکہ اگلے دن انہیں گڑا گردن پر رکھ کر اکھاڑے کے چکر لگانے پڑے تھے......بس سب خوش......؟؟

رستم زماں غلام محمد گاما پہلوان کا گڑا دو من کا تھا۔ تاکہ ان کا حریف گردن پر بیٹھ جائے تو وہ اسے اُٹھا کر پٹخ سکیں۔ سنا ہے زندگی میں موت کا بخار بھی گردن سے سر کو چڑھتا ہے۔ پیٹھ سے بائیں رخ گھس کر' دل کی طرف نقب لگاتا ہے۔ دل و روح پر نقب کے لیے شیطان اسی رستے سے آتا ہے۔ اس بخار کو اتار پھینکنے کے لیے جسمانی طاقت کی نہیں' روحانی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان کا گڑا دو من کا نہیں تھا' جتنے بھی وزن کا تھا ان تینوں نے گردن پر اٹھا کر اکھاڑے کے چکر لگانے شروع کر دیئے تھے۔ بھاء ان کے چکر گن رہے تھے۔ سب کی اُردو کمزور تھی یا ان کے اسکولوں کے ماسٹر ہی ڈھیلے رہے تھے۔ کسی کو بھی ٹھیک والی گنتی آتی ہی نہیں تھی۔

''یہ بڑی بے ایمانی ہے۔ ایک' دو' تین...... ایسے ٹھیک ٹھیک گنتی گنیں نا...... یہ پا' ادھ پا' پونا' وغیرہ سب کیا ہوتا ہے؟'' ہادی نے جھنجھلا کر گڑے کو زمین پر ٹکا لیا۔ اس کا سانس اس کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''بیٹا جی! یہ بھی گنتی ہی ہوتی ہے۔ ہمیں ہمارے اُستادوں نے یہی سکھائی ہے۔ استاد کا علم افضل ہوتا ہے۔ چلو اب میں ادھ پا' پونا وغیرہ نہیں کرتا۔ ٹھیک ہے؟ درمیان میں بولنے کی سزا پر پانچ نمبر پیچھے۔ چلو شاباش ہن شروع ہو جاؤ۔''

''چھ شیر...... چھ شیر دا ابا...... چھ شیر دی اماں...... چھ شیر دی نانی...... چھ شیر دی ماسی...... سوہنا چھ...... لوہن ہویا پورا چھ......''

''لغت پہلوانی'' نے ان کے کڑاکے نکال دیے تھے۔ دس چکر تھے کہ پورے ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔

''تمہیں درمیان میں بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ لو پھر گئے پیچھے...... چھ شیر دی کپتی پھوپھی......'' طلال نے دانت پیسے۔

چھ شیر کی کپتی پھوپھی کے دانت نکل آئے......

☆ ☆ ☆

کوشش کے باوجود وہ حویلی سے باہر نہیں جا سکے تھے۔ وہ بھاء سے ڈرتے تھے‘ پہلوانوں سے یا وہ خود ہی جانا نہیں چاہتے تھے...... وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکے تھے۔ جب کبھی وہ چھپ کر‘ بچ بچا کر بھاگ نکلنے لگتے‘ ان کے ارادے کمزور پڑ جاتے۔ تھوڑی دور جا کر ہی واپس آ جاتے۔ سوچتے بھاء کا دل برا ہو گا۔ انہیں بھاؤ کو خدا حافظ کہہ کر نکلنا چاہیے۔ انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ وہ بھاء کے ٹرانس میں چلے گئے ہیں۔ جب تک وہ بھاء کے آس پاس رہتے تھے‘ ٹھیک رہتے تھے۔ جانے کا سوچتے تھے تو ان کے دل بیٹھنے لگتے تھے۔ ڈپریشن ہونے لگتا تھا۔ انہیں بھاء کی زبردستیاں اچھی لگنے لگی تھیں......

یہ زبردستیاں انہیں زہر لگنے لگی تھیں......

یہ تو انہیں بھی نظر آ رہا تھا کہ حویلی کے اکھاڑے میں خاص مقابلوں کے لیے کبڈی اور کشتیوں کی تیاری کی جا رہی ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس **دنگل** میں انہیں بھی شریک کر لیا جائے گا۔ ایسے یا ویسے...... ورنہ کیسے بھی......

جس میدان میں کبڈی اور کشتیوں کے لیے ڈھول پیٹے جا رہے تھے‘ وہاں کم و بیش میلے کا سا سماں تھا۔ وہ غیر دلچسپی سے اس میدان میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ زمانہ نیا تھا لیکن زمانے کا بہروپ پرانے وقتوں میں بدل گیا تھا۔ تب شاید لوگ تانگوں‘ گھڑ گاڑیوں‘ ریڑھیوں‘ سائیکلوں پر آتے ہوں گے۔ اب کاروں‘ موٹر سائیکلوں‘ چھوٹی بڑی بسوں‘ موٹر سائیکلوں وغیرہ پر آئے تھے۔ تب میلوں میں **دنگل** ہوتے ہوں گے۔ اب **دنگل** ہی میلہ تھا۔

کالج یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد آئی تھی۔ اسکولوں‘ مدرسوں وغیرہ کے بچے بچیاں۔ پتا نہیں گوجرانوالہ میں تفریح کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا‘ یا انہیں یہی تفریح پسند تھی...... بھاؤ بھولو کے پہلوانوں کی کبڈیاں اور کشتیاں......

میدان میں نمایاں جگہ پر بھاء بھولو کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صبح سے وہ انہیں نظر نہیں آئے تھے۔ اب ان سے نظر ملی تو ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے ہادی کو اپنے پاس بلایا۔ جیسے ہی وہ ان کے قریب گیا‘ سلام کیا‘ تو انہوں نے لپک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے تھپک کر اگلے ہاتھ میں منتقل کر دیا...... پہلوان کے ہاتھ میں......

”کھیل ہمارا ہادی شروع کرے گا......“ بھاؤ نے بلند آواز سے کہا۔

”کھیل...... ہادی...... شروع......“ وہ ان لفظوں کا مطلب سمجھتا اس سے پہلے پہلوان نے اسے گڑے کی طرح اٹھا کر سر سے بلند کر لیا۔ ڈھول اور لوگوں کا شور اس کے بعد اٹھا اور کان پڑی آواز سنائی دینا بند ہو گئی۔

کھیل با قاعدہ شروع ہو چکا تھا۔ اسے اٹھائے اٹھائے پہلوان نے میدان کا چکر لگایا۔ بچے تالیاں مارنے لگے۔ لڑکے سیٹیاں۔ **دنگل** شروع کرنے سے پہلے‘ وہ بچوں‘ بڑوں کو محظوظ کرنا چاہتے تھے...... بس...... اتنی سی بات تھی......

اتنی سی بات پر ہادی خواہ مخواہ ہاتھ پیر ہلا رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ جتنا وہاں شور تھا‘ اس کی آواز کس نے سننی تھی۔ پھر پہلوان نے اسے مجمع میں اچھال دیا۔ کالج کے چار پانچ لڑکوں نے اسے اچھی طرح سے کیچ کر لیا تھا......

''اس بے چارے کے ساتھ کچھ زیادہ ہی نہیں ہو جاتا ہر بار؟'' طلال نے ابراہیم کو کہنی ماری۔

''آہستہ بولو ورنہ.....دس مرغی.....دس مرغی دا انڈا.....دس مرغی دا دوسرا انڈا.....دس مرغی دا تیسرا انڈا.....شروع ہو جائے گا۔ ان انڈوں میں سے چوزے نکل آئیں گے لیکن دس عدد کی گنتی پوری نہیں ہو گی۔''

ابراہیم نے بھرپور سنجیدگی سے کہا تھا۔ طلال بھی پوری ایمان داری سے ہنسا تھا۔ اس کی ہنسی ذرا دور بیٹھے بھاء نے دیکھی اور خود بھی ہنس دیئے۔ اور پھر طلال بلند ہواؤں کی سیر کرنے لگا.....اسے لڑکوں کی طرف اچھالا گیا تو وہ بہت خجل ہوا.....لیکن پھر مسکرا دیا۔

''بھاء کہہ رہے ہیں اک وری ہور.....'' ہادی گرتا پڑتا غصے میں میدان سے ہی باہر جا رہا تھا کہ ایک پہلوان بھاگتا ہوا آیا اور اسے کمر سے پکڑ لیا۔

''کس خوشی میں اک وری ہور.....چھوڑو مجھے.....'' ہادی نے غصے سے خود کو اس کی گرفت سے الگ کرنا چاہا لیکن پہلوان کو غصہ آتا نہیں اور پہلوان پر غصہ نکلتا نہیں۔

لوگ سیٹیاں مار رہے تھے' لڑکے تڑپ رہے تھے کہ پہلوان انہیں اٹھا کر اچھالیں لیکن جس کی طرف بھاء اشارہ کر رہے تھے' پہلوان اسے ہی اٹھا رہے تھے۔ مجمع میں سے چند لاغر' ضعیف بوڑھوں کو بھی اٹھایا گیا۔ پھر کچھ ایسے واپس اچھال دیا گیا' کہ نا بابوں کو چوٹ آئی' نا کیچ کرنے والوں کو ان کی کوئی ہڈیاں چبھیں.....

دنگل شروع ہو چکا تھا۔ نیلی' پیلی کاغذ کی جھنڈیوں کی اوٹ سے تینوں بھاء کے جوش و خروش سے دمکتے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ یہ میلہ' یہ رونق' یہ دنگل' سب بھاء کی وجہ سے ہو رہا تھا.....انہیں اپنے پہلوانوں پر فخر تھا.....فخر تھا کہ ان کے پہلوان تین سو ساٹھ داؤ جانتے ہیں.....

تین سو ساٹھ داؤ.....

☆ ☆ ☆

''جس دن میرا دنگل تھا اس دن وہ میرے کان کے قریب آیا اور بس اتنا کہا۔''

''بھولو یہ دنگل تجھے ہارنا ہو گا ورنہ باؤلا ہو جائے گا۔''

''ایسی دھمکیاں اور ایسی للکاریں میں نے بہت سنی تھیں۔ میرے استاد نے سکھایا تھا کہ دنگل بس دنگل ہوتا ہے۔ جیت جاؤ تو بھول جاؤ' ہار جاؤ تو دوبارہ کمر کس لو.....بس.....مجھے یاد بھی نہیں تھا کہ میں کتنے دنگل جیت چکا ہوں۔ لوگ گنتی کرتے ہو تو کرتے ہو۔ جیت کو میں اکھاڑے کی مٹی میں دفنا کر نکلتا تھا۔ لیکن.....کریم بخش اپنی ہار کو گن گن کر سنبھال سنبھال کر رکھتا رہا تھا۔ میرے اس دنگل کی بہت دھوم تھی۔ بے وقوف لوگوں نے بڑی بڑی شرطیں لگا رکھی تھیں۔ دوسرے شہروں سے لوگ اس دنگل کو دیکھنے کے لیے آ رہے تھے۔ لوگ باؤلے سے ہو گئے تھے.....''

''پھر.....آپ وہ کشتی جیت گئے.....؟''

''یاد نہیں...... لیکن باقی سب یاد ہے...... میری حویلی کی دیواروں پر لکھا تھا ''جیت مبارک ہو بھولو......''

تینوں نے ناسمجھی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''کیا لکھا تھا؟''

''جیت مبارک ہو بھولو' یہ لکھا تھا۔ میرے بچوں کے خون سے۔ میری ماں' میرے باپ' میرے شہہ جوان بھائیوں' میری سہاگن بہنوں کے خون سے...... ایک ایک دیوار پر لکھا تھا......''

وار کارا بھی تھا اور جان لیوا بھی...... ہادی کے دل کو زوردار جھٹکا لگا......

''س...... سب گھر والے؟'' ادھورا سوال...... پورا احساس......

''پورا خاندان۔ میرے بھائی' بھابھیاں' بہنیں' بہنوئی' ان کی اولادیں۔ چاچے' مامے۔ خاندان بھر کو اکٹھا کر کے میرا باپ مٹھائیاں کھلا رہا تھا۔ ماں شربت کے گلاس بھر بھر کر پلا رہی تھی۔ بہنوں کی نظریں چوکھٹ پر لگی تھیں۔ میرے تینوں بیٹے کلف لگے سفید کرتوں میں بھاگے دوڑے پھرتے تھے۔ ماں نے چاء میں ہاتھوں پر مہندی لگائی تھی۔ اتر تی پھرتی تھی۔ کہتی پھرتی تھی......

''میرا پتر سارے شہر دا مان اے۔ اللہ جوانیاں مانیں......''

رات اندوہناک تھی...... سیاہ کٹاری......

اس دن کی روشنی بڑی قیامت خیز تھی۔ سارا محلہ' پورا شہر حویلی میں اُمڈ آیا تھا۔ بھولو بھاگ بھاگ کر ایک ایک کا منہ چومتا پھر رہا تھا۔ تالاب کنارے' چوباروں' دہلیزوں پر' اکھاڑے کی مٹی میں' کمروں اور مسہریوں پر۔ لوگ اسے پکڑ پکڑ کر روک رہے تھے اور وہ سب کو پیچھے دھکیلتا جاتا تھا۔ پھر اس نے اپنی سفید پگڑی اتاری اور ایک ایک دیوار سے ایک ایک پیارے کا خون صاف کرنے لگا۔ لوگوں نے کہا بھولو باؤلا ہو گیا ہے۔ ماں کی میت کے سرہانے غم سے گرا بھولو دوبارہ نہیں اُٹھ سکا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو چکا تھا۔

سب سوال ختم ہو گئے...... تینوں نے چپ سادھ لی......

''رستم زماں گاماں پہلوان کو زہریلے سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ گاما جی نے تکلیف سہہ کر' جھک کر سانپ کو پکڑ کر کچل دیا تھا۔ سانپ کے دانت ان کی ٹانگ میں گھس گئے تھے۔ انہوں نے پہلوانی کو دھبہ نہیں لگنے دیا تھا۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو موقع پر ہی دم توڑ دیتا۔ اسی لیے میرے باپ نے کہا تھا۔

''پتر! پہلوانی کو داغ نہ لگنے دینا۔ تمہاری اصل طاقت پر ایک امتحان آئے گا۔ ایک آزمائش...... سرخرو ہو کر دکھانا......''

ہادی کا حلق آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا......

''من من کے گڑے اٹھائے تھے' پندرہ سولہ کلو کی بیٹوں کی میتیں نہیں اٹھائی گئیں۔ سالم دنبے بکرے کھائے تھے' کوڑی روٹی کے دو نوالے نہیں کھائے گئے۔ سیروں دودھ پیا تھا' صبر کے دو گھونٹ پینے بہت اوکھے لگے۔ غم کا دنگل بہت کڑا تھا۔ آزمائش کے اس اکھاڑے کی کشتی بہت مشکل تھی......'' بھا اپنی گیلی آنکھیں پونچھ رہے تھے۔

''میں عمر بھر کے لیے مفلوج ہو چکا تھا۔ واقعی میں باؤلا ہو رہا تھا۔ دیواروں سے ٹکریں مارتا تھا۔ پر پہلوانی میں تین سو ساٹھ داؤ سیکھے

تھے میں نے‘ ایسے کیسے ہار مان لیتا۔ ایک دن ایک داؤ کھیلا...... اگلے دن ماں کا غم مجھے ہرانے آیا‘ میں نے بھی اگلا داؤ چل دیا۔ تیسرے دن بیٹے یہاں وہاں بھاگتے دوڑتے دکھائی دیے...... میں نے پھر داؤ چل دیا۔ بہنوں کے لاڈ‘ بھائیوں کا مان...... میں داؤ پر داؤ چلتا رہا...... بس چلتا رہا...... میں رکا نہیں...... میں نے ہار نہیں مانی......

اس طرح میں نے ہر روز ایک داؤ کھیلنا شروع کر دیا۔ تین سو ساٹھ دن‘ میں نے رستم زماں بن کر کشتیاں کیں۔ غم سے دو بدو دنگل لڑا۔ سوگ اور روگ کا اکھاڑا تھا‘ اور ہر طرف مجھے چت کر دینے والے غموں کے پہلوان ہی پہلوان تھے۔

تین سو اکسٹھوے دن مجھے جیت نصیب ہوئی تھی۔ مجھے بس اپنی یہی جیت یاد ہے۔ اللہ نے میرے دل ہلکا کر دیا تھا۔ روح سے بوجھ اور روگ دونوں رخصت کر دیے تھے۔ مجھے صبر کے اتھاہ سمندروں کا مالک بنا دیا تھا۔ اس دن مجھے ماں یاد آئی......

’’بھولو! ذرا ہنس کے تے وکھا......‘‘

پھر میں نے ہمیشہ ہنس کر ہی دکھایا اور حویلی کا پھاٹک کھول کر بیٹھ گیا۔ اکھاڑے کی مردہ مٹی کو زندہ کرنے لگا۔ جوان آنے لگے‘ پہلوان بننے لگے۔ بڑے بڑے میدان فتح ہونے لگے۔ حویلی میڈیلوں اور ٹرافیوں سے بھرنے لگی۔ پتا نہیں کون کون سے لوگ اور این جی اوفنڈ دینے لگیں۔ مجھے کوئی حساب کتاب نہیں۔ بس جو چاہیے ہوتا ہے وہ مل جاتا ہے۔ اس حویلی سے باہر نکلو تو کہیں کوئی نشئی‘ ویلا‘ نکما‘ آوارہ‘ چور اچکا‘ نہیں ملے گا۔ لوگ گردن سے پکڑ پکڑ کر حویلی چھوڑ جاتے ہیں کہ ’’بھاءا سے بندے کا پتر بنا دو۔

میں نے خدا کی رضا پر اپنا سوگ توڑ دیا‘ اللہ نے اپنی مخلوق مجھ سے جوڑ دی...... بھاں بھاں کرتی حویلی ہری بھری ہو گئی۔ اب میں کسی کا چاچا ہوں‘ کسی کا ماما‘ کوئی دادا کہتا ہے کوئی نانے کی طرف لاڈ کرتا اور کرواتی ہے۔ بس بہت ہے اتنا۔ اور انسان کو کیا چاہیے......‘‘

’’اور وہ...... جنہوں نے مارا تھا......؟؟‘‘ طلال نے بھاء کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر عقیدت سے پوچھا۔

’’اللہ کی آنکھیں بند نہیں ہوتیں پتر! وہ سب دیکھتا ہے۔ ہر لمحہ دیکھتا ہے۔ انگلی اٹھانے والوں کو بھی اور گردنیں کاٹ دینے والوں کو بھی۔ میں نے جو پہلا داؤ کھیلا تھا وہ یہی تھا......‘‘

’’کیا......؟؟ ہادی پوچھ رہا تھا۔

’’میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں جمع کروا دیا تھا۔ اس کے انصاف پر یقین کو کامل کر کے‘ الٹے پیروں واپس زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ اب وہ جانیں اور اللہ۔ میرے دشمن ذرا سی ہار کو اپنی گردن پر نہیں سہار سکے تھے۔ میں نے اپنے خاندان کی میتیں اپنی کندھوں پر اٹھا کر دل پر صبر کا تعویز سجا لیا تھا۔‘‘

’’آپ کا دوسرا داؤ کیا تھا......؟؟‘‘ اسے شدت سے طلب ہوئی کہ وہ سب جواب ایک ہی سوال میں جان لے......

’’صبر کا...... اور میرا آخری داؤ‘‘ اللہ کی رضا میں راضی ہو جانے کا تھا۔‘‘ اس آخری داؤ کو میرا ’’پہلا‘‘ داؤ ہونا چاہیے تھا۔

☆ ☆ ☆

زندگی جیتنے کے لیے تین سو ساٹھ داؤ آنے چاہیے۔ ورنہ صرف ایک۔’’ انسان کو جینا آنا چاہیے‘ مرتو سب نے جانا ہی ہے۔‘‘

غم کو ہرانے کے لیے صرف تین داؤ بہت ہیں۔ ''ایمان، صبر، رضا''

اور اللہ کی محبت جیت لینے کے لیے صرف ایک..... ''جو میرے رب نے چاہا میں اس پر راضی ہوا۔''

☆ ☆ ☆

چاچا امام دین نہیں ملے تھے۔ انہیں ان کے اگلے ٹھکانے کا اتا پتا مل گیا تھا۔ جس وقت وہ اپنی کار میں بیٹھ کر گوجرانولہ کی حدود سے باہر نکل رہے تھے، اس وقت انہیں ویسی ہی چپ لگی ہوئی تھی، جیسے کھیوڑہ کان سے نکلتے ہوئے لگی تھی۔ ابھی تو نہیں لیکن شاید کبھی وہ سمجھ جائیں کہ بھاء کے پاس وہ زندگی کے زیادہ قریب تھے یا موت سے بہت دُور..... ان سے دل کا تعلق تھا یا روح کا.....

اب وہ ملتان کی طرف رواں دواں تھے..... صوفیوں اور درویشوں کے شہر.....

محلّہ کماں گراں کے ہنرمندوں اور بہاؤالدین زکریا کے شہر.....

''یار یہی گھر ہے نا.....؟؟''

سب سے آگے طلال ہی تھا اور وہ اپنے پیچھے کھڑے ابراہیم سے پوچھ رہا تھا۔ گھر کے لکڑی کے کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ اندر باہر، ہر طرف سے گھر پوری طرح سے سفید تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کے بیل بوٹوں، پھولوں، کلیوں کے نقش و نگار سے سجا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں گھر پر چھوٹی سی مسجد کا گمان ہوا تھا۔ دوسری نظر میں کسی مدرسے وغیرہ کا.....

''اس آدمی نے اسی گھر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کے آس پاس اور کوئی گھر بھی نہیں ہے۔'' تھوڑا شک ابراہیم کو بھی تھا۔

''اسلام علیکم جی!'' بڑے سارے دوپٹے میں چھوٹی سی بچی دروازے تک آئی۔ مسکرا کر کہا

''وعلیکم اسلام! ہمیں اماں نوری سے ملنا ہے۔ چاچا امام دین یہیں ہیں؟'' طلال نے بچی کے گال کو مسکرا کر چھوا۔

''چاچا جی کل رات آئے تھے۔ اماں جی بازار گئی ہیں۔ آپ اندر آ جائیں۔''

بچی نے بڑے مودب انداز میں ان کے لیے راستہ چھوڑ کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ اندر آ گئے تو وہ ان سے دو قدم آگے ہو کر چلنے لگی۔ ذرا دُور درختوں کی چھاؤں میں صفیں بچھی تھیں، جن پر بیٹھے بچے، بچیاں سفید پیالوں پر پھول، بوٹے بنا رہے تھے۔

بچی انہیں ایک کمرے میں لے آئی۔ طلال اور ہادی تخت پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ابراہیم نے موڑھا گھسیٹ لیا۔ ان کی پشت کی طرف کھڑکیاں کھلی تھیں۔ درختوں کی کچھ شاخیں کھلی کھڑکیوں سے اندر آ رہی تھیں۔ پھولوں کی خوشبو، اور سبزے کی تازگی..... دو اور بچے اندر آ گئے، اور ان کے سامنے کھڑے ہوئے ہو کر شیشوں سے سجے ہتھ پنکھے سے انہیں ہوا دینے لگے۔

''بجلی نہیں ہے.....'' بچی نے پنکھا جھلنے کی وجہ بتائی۔

تینوں زیر لب ہنس دیئے۔ ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر بچے کے ہاتھ سے پنکھا لینا چاہا تو اس نے دینے سے انکار کر دیا۔

''ابھی نہیں..... آپ کا پسینہ خشک ہو جائے پھر.....''

جن پیالوں پر بچے نقش نگاری کر رہے تھے' ان جیسے پیالوں میں ان کے لیے ٹھنڈا میٹھا پانی آ گیا۔ کچھ دیر بعد بچوں نے ان کیلئے چٹائی بچھا کر دستر خوان لگا دیا۔ پتلی دال سے پیالے بھرے ہوئے تھے اور وہ بھاگ بھاگ کر ان کے لیے گرم گرم تنوری روٹیاں لا رہے تھے۔

''بس کرو دو یار! پیٹ پھٹ جائے گا ہمارا.....'' ہادی نے ہاتھ کے اشارے سے بچوں کو روکا۔ وہ ایسے ہی گرم گرم روٹیاں لاتے رہتے تھے تو وہ شام تک کھاتے ہی رہتے۔

''باجی کہہ رہی ہیں نماز کا وقت ہو گیا ہے' آپ کو مسجد تک لے جائیں.....'' کھانے کے بعد ٹوپیاں پہنے بیس بائیس بچوں کا گروپ ان کے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ نمازوں سے تو وہ بہت دُور نکل آئے تھے لیکن اتنے سارے بچوں کے سامنے شرمندہ بھی نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اٹھے اور ان کے ساتھ مسجد تک چلے گئے۔

مسجد سے واپسی پر کمرے کی سمت جاتے جاتے طلال انہاک سے نقش بناتی بچی کو دیکھ کر رُک گیا۔ قدم بڑھا کر وہ اس کی سمت آیا اور پھر اس کے پاس نیچے ہی بیٹھ گیا۔

''بہت خوب صورت ..... تمہارے ننھے ہاتھوں میں کمال کا فن ہے.....''

''آپ کو اچھا لگا؟ یہ میں آپ کے لیے ہی بنا رہی ہوں.....'' اس نے سر اٹھا کر مسکرا کر کہا۔

وہ ہنس دیا۔ ''میرے لیے.....لیکن تم تو مجھے جانتی بھی نہیں ہو.....''

''جب آپ مسجد جا رہے تھے تو باجی نے آپ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ مجھے آپ کے لیے پیالہ بنانا ہے.....''

وہ حیران ہوا۔ ''اچھا.....انہوں نے ایسا کیوں کہا.....؟''

''انہوں نے کہا آپ کے سر میں بہت درد رہتا ہے۔''

اس کے سر میں واقعی ہر وقت درد رہتا تھا۔ ''اور کیا کہا انہوں نے؟''

''کہا کہ مجھے 'یا ارحم الرحمین' کا ورد کرتے ہوئے اس پر نقش بنانے ہیں۔ عصر کی نماز کے بعد۔''

اس کے پاس سوال کرنے کے لیے اور کچھ نہیں بچا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ نیلے آسمان کے نیچے پرندے گھومن گھیریاں بنانے میں مصروف ہو چکے تھے۔

''خیریت سے پہنچ گئے تھے یہاں۔ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟؟''

وہ چونک کر پیچھے مڑا۔ شاید وہ اماں نوری تھیں۔ ضعیف و ناتواں لیکن خوش اُمید اور ہشاش بشاش۔ اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''جی.....آپ کو ہمارے آنے کی خبر تھی؟'' اس نے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے سبزی کا تھیلا لے لیا اور ذرا دور رکھے تخت پر رکھ دیا۔

وہ ہنس دیں۔ ''ہم پرانے زمانے کے لوگ' آج بھی کوؤں کو بہت اہمیت دیتے ہیں.....''

''یہ میں نے بنا لیا ہے.....دیکھیں کیسا بنا ہے؟'' بچی نے اپنا پیالہ اماں نوری کے سامنے کیا۔

''ماشاءاللہ۔تم نے تو کمال کر دیا ہے۔جاؤ اسے صالحہ کے پاس لے جاؤ۔'' بچی کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ اسے ساتھ لے کر درخت کے نیچے موڑھوں پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''ہم چاچا امام دین سے ملنے آئے ہیں......کہاں ہیں وہ......؟''

''صبح نکلے ہیں یہاں سے۔کہہ رہے تھے' رات تک آ جاؤں گا۔''

''ہم گوجرانوالہ سے انہیں ڈھونڈتے یہاں آئے ہیں۔''

''چلو اب یہاں مل لینا......''

''یہ سب برتن آپ بناتی ہیں......'' طلال نے لکڑی کے تخت پر ترتیب سے رکھے پیالوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''میں کچھ نہیں کرتی۔میری بیٹی ہے صالحہ'وہی یہ سب کرتی ہے۔بچے بھی اسی کے پاس آتے ہیں۔یہ جو برتن سامنے رکھے ہیں یہ تیار ہو چکے ہیں'اب جن جن کے ہیں وہ آتے جائیں گے اور لیتے جائیں گے۔''

''اور یہ گھر......؟'' گھر کے سکون کے تینوں پہلی ساعت میں ہی مداح ہو چکے تھے۔

''یہ گھر...... یہ بھی اسی کے ہاتھوں کا کمال ہے۔جب کچھ اور نہیں کر سکی تو یہ کرنے لگی۔'' ان کی آواز میں ہلکی سی اداسی سمٹ آئی۔

''میں نے آج سے پہلے کبھی اتنا خوب صورت گھر نہیں دیکھا۔'' اس نے ایمان داری سے کہا۔

''مغرب کی نماز کا وقت ہونے والا ہے اماں! مہمانوں کو بھی متوجہ کر دیں......''

درختوں کے پیچھے کہیں سے آواز آئی۔اس نے اتنی خوب صورت آواز بھی کبھی کہیں نہیں سنی تھی۔گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ جا چکی تھی......

وہ جا چکی تھی تو اس کی آواز کیوں اس کی ساعتوں میں ٹھہری رہ گئی تھی......

☆ ☆ ☆

اگلے دن صبح ابراہیم اماں نوری سے باتیں کرنے لگا اور ہادی بچوں کے ساتھ صف پر بیٹھ کر ایک سفید پیالے کو برباد کرنے لگا۔اس سے پہلے اس نے رنگوں سے بچوں کے گالوں پر کچھ کارٹون وغیرہ بنا دیئے تھے۔بچے اس سے بہت خوش تھے۔چاچا امام دین رات کو گھر نہیں آئے تھے۔انہیں آج کا دن بھی ان کے انتظار میں گزارنا تھا۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے چھت پر آ گیا۔چھت کی منڈیروں پر بھی فنکار نے اپنی فنکاری دکھادی تھی۔دُور کونے میں وہ لکڑی کے تخت پر بیٹھی کسی کام میں مصروف تھی۔پہلے اس نے واپس نیچے چلے جانا چاہا۔لیکن جب وہ چاہ کر بھی وہاں سے ہل نہیں سکا تو اس نے اس کی سمت ہی قدم بڑھا دیئے......

پتلے باریک برش کو ہلکے نیلے رنگ میں ڈبو کر وہ پیالے کے پیندے میں آیتیں لکھ رہی تھی۔جو لکھ رہی تھی انہیں زیر لب دہرا بھی رہی تھی۔وہ خاموش کھڑا دیکھتا رہا......اسے گمان گزرا کہ اسے یہیں آنا تھا......ہمیشہ سے......

صالحہ نے اس کی موجودگی کو محسوس کرلیا تھا۔اس نے سر کو زرا سا اس کے رخ پر موڑا۔ایک جھلک دیکھ لینے پر وہ غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹا تو وہ مسکرا کر اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پیالہ اٹھایا اور اس کے سامنے کیا۔

''یہ لیں آپ کا آب خورہ بن گیا ہے۔''

وہ خاموش کھڑا رہا۔ہاتھ بھی نہیں بڑھایا۔ذرا دور بہاؤالدین زکریا کے مزار کے سفید گنبد سے کبوتر پھڑاڑے۔ان کے پروں کا شور اسے صاف سنائی دیا......

''پینے کی ہر چیز اس میں ڈال کر پئیں۔اللہ شفاء دیں گے۔'' پیالہ اسے تھما کر وہ پلٹ کر تخت پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔پھر جب وہ نیچے جانے لگی تو جاتے جاتے رک کر اسے دیکھنے لگی۔

''ویسے آپ بھی ڈر گئے تھے کیا......؟؟''

اس نے شرمندگی سے ناں میں سر ہلایا۔''آئی ایم سوری......''

''اٹس اوکے۔مجھے ویسے بھی عادت ہوچکی ہے۔خوب صورتی کی انتہاء ہو یا بدصورتی کی'انسان دیکھ کر چونک ہی جاتا ہے۔''

''یہ......یہ کیا ہوا......؟؟'' جھجکتے ہوئے اس نے اس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ مسکرا دی......''جھلس گیا......تیزاب سے......''

☆ ☆ ☆

وہ کالج سے بابا کی دکان کی طرف آرہی تھی۔ہوا اتنی تیز تھی کہ اس سے اپنا دوپٹہ اور ہاتھ میں پکڑی فائل سنبھالنا محال ہو رہا تھا۔دوپٹے کے کنارے بار بار اس کے جسم سے آزاد ہو کر ہوا کے ساتھ پھڑ پھڑانے لگتے تھے۔وہ عاجز آچکی تھی اور جی چاہتا تھا کہ ہوا کو سامنے کھڑا کر کے مرغا بننے کے لیے کہہ دے۔

مرغا بننے سے پہلے ہوا نے ایک تیز جھونکا اس کی طرف اچھالا اور دوپٹہ جہاز کے بادبان کی طرح کھل کر لہرانے لگا۔ایک آخری سرا اس کی گردن میں اٹکا رہ گیا تھا......ششدر ہو کر اس نے سر پیچھے گھمایا تو اس کے دوپٹے نے پیچھے والے کا پورا چہرہ ڈھانپ دیا تھا اور وہ ہاتھ مار کر چہرے سے دوپٹہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا......بادل چھٹتے ہیں تو چاند نکلتا ہے......دوپٹہ ہٹا تو چاند اور چاندنی دونوں نکلے......

وہ دم بخود رہ گئی اور پورا زور لگا کر دوپٹہ کھینچا اور اپنے گرد کس لیا۔غصے سے اسے گھورا جیسے یہ سب اسی کا کیا دھرا ہو۔جبکہ اس کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔دوپٹہ اس کا......ہوا اللہ کی......حادثہ حادثاتی......وہ تو بے چارا انسان تو بس ملتان کا بازار دیکھنے نکل کھڑا ہوا تھا۔

''میری دادی کہتی ہیں تیز ہوائیں چلیں تو چڑیلیں بال کھول کر ہم انسانوں کو تنگ کرنے کے لیے ٹولیاں بنا کر باہر نکلتی ہیں......اور میں یہ بتادوں کہ میری دادی جھوٹ ووٹ نہیں بولتیں۔''

پلو کھینچ کر اس نے دوبارہ سر پر رکھا تھا' اور غصے سے چلتی ہوئی چند قدم آگے گئی ہی تھی کہ پیچھے سے اس کی آواز آئی۔کالے بادل مل ملا کر پورا زور لگا کر گرجے۔اور اپنا کالا اچھا تا پورا کھول کر سارے دن کو چھپالیا۔وہ ایسی تیز طرار تھی تو نہیں تھی لیکن پھر بھی نجانے کیوں پلٹ

کر اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''اور میری نانی کہا کرتی ہیں کہ بادل گرجیں تو الوؤں کی شکل جیسے جن بھوت ہم معصوم انسانوں کا خون پینے کے لیے اکیلے دکیلے اپنے ٹھکانوں سے نکل پڑتے ہیں...... اور میں یہ بتا دوں کہ میری نانی صرف سچ وچ بولتی ہیں......''

الوگردن کو جھٹکا دے کر ہنسا۔ اسی وقت بادل پھر سے گرجے اور بجلی نے کڑک کر پورے آسمان پر جال بچھا کر اندھیرے کو روشن کر دیا۔ دونوں نے بیک وقت سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ دونوں نے بیک وقت سر جھکا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں ایک ہی وقت میں دم بخود ہوئے...... اور......

''یا اللہ خیر!'' اس کا دل دہل گیا۔ بجلی سے سہم کر کہا۔

''یا اللہ خیر!'' اس کے دل پر بجلی گری اور اس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ صالحہ نے ایک خفا خفا سی نظر اس پر ڈالی اور تیزی سے بارش کی بوندوں پر ہاتھ مارتی' بابا کی دکان کی طرف بڑھ گئی۔

بارش برستی جاتی تھی...... وہ سامنے بھاگی جاتی تھی...... کالے بادلوں کے سائے میں وہ پیچھے چپ کھڑا تھا......

چپ محبت بڑی اثر انگیز ہوتی ہے......

وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کیسے اور کس طرح خبر ہو جایا کرتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ وہ جہاں جاتی' اسے پاتی۔ پیچھے سے آتے' سامنے سے گزر جاتے' شانے سے ٹکرا کر ہوا ہو جاتے......

صالح لوگوں کی محبت بڑی پر امن ہوتی ہے......

اس نے کبھی نظر بھر کر اسے دیکھنے کی جرات نہیں کی تھی۔ اس کے بابا کی ڈاڑھی سفید تھی۔ ماں کی نظروں میں بڑی حیا تھی۔ لیکن دل انسان کا' وقت ارمانوں کا ہو تو نیند سے پہلے انسان بڑی جراتیں کر لیتا ہے۔ چوڑیوں کی کھنک پر اپنی ہنسی کو کھنکاتے ہوئے' اپنے پیچھے اس کے سائے کو محسوس کرتے ہوئے' وہ سوہنی' سسی' ہیر سب ہو گئی تھی......

''دل بہت بے چین رہتا ہے جی! اس میں پانی پینے سے چین آ جائے گا؟'' ایک آب خورہ اٹھا کر وہ بابا سے پوچھ رہا تھا۔

وہ اپنے دھیان سے بابا کی دکان میں آئی تھی۔ جب وہ پلٹا تو آب خورہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا جسے اس نے تیزی سے جھک کر پکڑ لیا۔ وہ وہیں بت سی بن کر کھڑی ہو گئی۔ بابا دور کچھ برتنوں کے ساتھ مصروف تھے۔ جھکے جھکے اس نے سر کو تھوڑا سا اٹھا کر اسے دیکھا۔

''آپ ہمیشہ ایسے ہی یہاں وہاں بجلیاں گراتیں ہوئی چلتی ہیں؟ ویسے ہی کہہ دیں 'مر جاؤ یوسف! میں مر جاؤں گا۔'' وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

''مر جاؤ......'' اس نے دانت پیس کر' ایک اور بجلی گراتے ہوئے کہا۔

''پوری طرح سے مر مٹ گیا ہوں...... اس دل سے...... اس جان سے...... اور کوئی حکم؟؟'' اب وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

وہ خوفزدہ ہو گئی۔ تیزی سے قدم اٹھاتی دکان کے پیچھے کا چھوٹا دروازہ کھول کر گودام میں آ گئی۔ دروازے سے پشت لگا کر گہرے

سانس لینے لگی۔ پھر درز میں سے جھانک کر اسے دیکھنے لگی۔ گیارہ مہینوں بعد اس نے ایسی جرات سے اُسے دیکھنا چاہا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اسے دیکھنے کا اس کے پاس بڑا حق ہے۔ وہ یہ حق حاصل کر چکی ہے۔ کچھ فیصلے چار لوگوں میں نہیں‘ چار لفظوں میں ہوتے ہیں۔ دو لمحوں‘ دو دلوں میں۔ کچھ نامحرم‘ صرف ایک دستک سے ہی محرم بن جاتے ہیں۔ دنیا کے قاعدے تو چلتے رہتے ہیں۔ محبت کرنے والے اپنا قاعدہ خود لکھتے‘ پڑھتے ہیں۔

ایک صراحی اس کے ہاتھ میں تھی اور اسے دیکھتے ہوئے وہ زیر لب ہنس رہا تھا۔ بابا سے باتیں کر رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ لکڑی کے اس چھوٹے دروازے کے پاس آ کر رک گیا اور عین اس جھری سے آنکھ لگا دی‘ جس کے پیچھے اس کی آنکھ لگی ہوئی تھی......

ایک لمحہ لگا...... دل ایک دھڑکن دھڑکا......

دو آنکھیں چار نہیں ہوئیں تھیں...... ’’ایک‘‘ ہو گئیں تھیں......

☆ ☆ ☆

سارے ظروف‘ جو وہ اٹھا اٹھا کر دیکھتا رہا تھا‘ وہ انہیں کتنے ہی دنوں تک اپنی ہتھیلیوں سے سہلاتی رہی تھی۔ اس نے محبت بہت اہتمام سے کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ دکھ اٹھائے گی‘ شاید جدائی بھی کاٹنی پڑے لیکن پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جیسا کہ سب محبت کرنے والے مانتے ہیں کہ ایک دن بہار ہوتا ہے‘ ایک خزاں پھر عید ہو ہی جاتی ہے...... تو اس کا بھی یہ ماننا تھا......

اس نے ملتان کی کوئی ایسی سڑک نہیں چھوڑی تھی‘ جہاں رک کر اس کی راہ نہ دیکھی ہو۔ وہ کبھی اسے روک کر‘ ہاتھ پکڑ کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ اسے بات کرنے یا ملنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ وہ جو کہتی‘ وہ سن لیتا تھا۔ جو وہ سوچتا‘ وہ پڑھ لیتی تھی...... بس اتنا ہی کافی تھا۔

اٹک سے یوسف اپنی اماں کو ان کے گھر لے آیا تھا۔ وہ اس شہر کا ہی نہیں تھا‘ ایک بار دوستوں کے ساتھ آیا تھا‘ اور پھر......

’’مجھے ایک ہی شوق تھا کہ میرا بیٹا پڑھ لکھ کر‘ ڈاکٹر‘ انجینئر بن جائے۔ تینوں بیٹیوں کو پڑھانے لکھانے کی بہت کوشش کی لیکن میرے سسرال خاندان کا ماحول لڑکیوں کے پڑھنے لکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن یوسف کے لیے میں ڈٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ شہر کی بڑی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ بہت ذہین ہے میرا یوسف...... معصوم بھی بہت ہے......‘‘

یوسف کی ماں جتنی دیر تک ان کے گھر رہیں‘ اس کے واری صدقے ہوتی رہی تھیں۔ بھولی بھالی سی خاتون تھیں۔ اماں‘ بابا کو رشتے پر تو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن انہیں ایسے اونچے خاندان میں بیٹی دینے سے خوف آتا تھا۔ پھر غیر برادری۔ دونوں کو خاندان بھر کی ناراضی کا بھی ڈر تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ گئے تھے کہ بیٹی کی پسند ہے۔ انکار کیا تو بیٹی روگ لگا کر بھی بیٹھ سکتی ہے۔ نئے زمانے کی چال سمجھتے تھے لیکن ایسے باغی بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ لوگوں کی باتوں سے بھی ڈرتے تھے۔ بات چھپی تو رہے گی نہیں کہ غیر برادری میں لڑکی کا رشتہ کیوں دیا۔ سہولت کے لیے اماں ابا نے کچھ وقت مانگ لیا تھا......

وقت جسے بدلتے وقت نہیں لگتا......

وہ بابا کی دُکان کی طرف جا رہی تھی۔ آج سیکنڈ شفٹ میں اس کا بی اے کا پہلا پیپر تھا۔ اماں نے صبح کھیر پکائی تھی۔ اس نے سوچا

کہ بابا کو کھیر بھی دے آئے گی اور انہیں سینٹر تک ڈراپ کرنے کے لیے بھی کہہ دے گی۔

چند دن پہلے اس نے یوسف کے لیے ایک پیالہ نقش کیا تھا۔ اس پر اپنا اور اس کا نام بھی لکھا تھا۔ زمین اسے گلستان اور آسمان چراغ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی لمبی سفید چادر کا پلو ہلکی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ وہ خوش تھی۔ اسے تمنا ہوئی کہ کاش کہیں سے یوسف اسے دکھائی دے جائے۔ دو ہفتے پہلے وہ اسے آخری بار نظر آیا تھا۔ گول کپے کھا رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ موٹر سائیکل پر اپنے کسی دوست کو بٹھا کر بازار کے چکر لگا تا رہا تھا۔ وہ اتنی اتنی دور سے سفر کر کے ایک نظر اسے دیکھنے آتا تھا۔ تو وہ بھی ایک نظر اسے دیکھنا چاہتی تھی......

ابھی وہ بابا کی دکان سے دس پندرہ دکانیں دُور تھی کہ ایک موٹر سائیکل اس کے پاس آ کر رکی۔ انہوں نے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی ہی تھی کہ اس کی لخراش چیخ نے وقت کا دم گھوٹ دیا......

سانسیں آگ تھیں......چیخیں انگارہ......

وہ بازار، وہاں کھڑے لوگ، اس کی چیخیں، اس کی طرف بڑھتا ہجوم......کہرام برپا ہوا......قیامت آئی اور اس پر ٹھہر گئی۔

پورے پانچ دن وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑتی رہی تھی۔ بیس دن بے ہوشی، نیم بے ہوشی میں اور تین مہینے ہاسپٹل میں رہی تھی۔ وہ مر مر کر زندہ بچ گئی تھی......لیکن اس کا کوئی پیار زندہ نہیں بچا تھا......

حادثے سے اگلے دن صبح کے اخبار میں یہ خبر آ گئی تھی کہ رشتے سے انکار پر لڑکے نے لڑکی پر تیزاب پھینک دیا ہے۔ لڑکی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے۔ دوسرے دن بابا کا بیان آ گیا کہ وہ یوسف کو قتل کر دیں گے، جس نے ان کی بیٹی کی زندگی برباد کر دی ہے۔ بازار کے کچھ دکانداروں کے بیان آئے کہ انہوں نے یوسف نامی لڑکے کو دکان کے چکر لگاتے دیکھا تھا۔ محمد رفیق کو یہ سب پسند نہیں تھا۔ رشتہ بھیجا تو محمد رفیق نے صاف صاف انکار کر دیا۔ یوسف دھمکیاں دینے پر آ گیا تھا......بات بہت بڑھ گئی تھی......

پانچویں دن یوسف کے قتل کی خبر اخبار میں تصویر کے ساتھ آ گئی تھی۔ اسے اس کے ہوسٹل میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اسی دن شام کو پولیس محمد رفیق کو پکڑ کر لے گئی تھی......

اب ہر روز ایک نئی افواہ ہوتی۔ ہر روز ایک نئی خبر چھپتی۔ مقدمہ چلنے لگا۔ چھ مہینے گزر گئے۔ ساتویں مہینے کے پہلے ہفتے وہ جیل میں ہی دم توڑ گئے۔

پولیس نے رپورٹ میں موت کی وجہ "ہارٹ اٹیک" لکھی تھی۔ جیل میں جو چند لوگ بابا کو جانتے تھے انہوں نے موت کی وجہ کسی زہریلی چیز کو بتایا تھا۔ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ جیل سے باہر، خاندان والوں، محلے والوں کا ماننا تھا کہ بیٹی کے کرتوتوں نے جان لے لی۔ اتنی بدنامی پر بھی موت کو گلے سے نہ لگاتا تو کیا کرتا......

بازار میں کوئی دکاندار ایسا نہیں تھا جو محمد رفیق جیسے شریف، نمازی، پرہیز گار انسان کی ایسی شرمناک موت پر ہاتھ اٹھا کر کانوں کو توبہ توبہ کرتے ہوئے ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ خاندان کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا جو اس بدکردار لڑکی پر تھوتھو نہیں کرتا تھا۔ ملتان میں کوئی گھر ایسا نہیں بچا تھا جو اس جیسی بیٹیوں کے پیدا ہوتے ہی مر جانے کی دعائیں نہیں کر رہا تھا......

گھر گھر اس کا نام تھا......گھر گھر وہ بدنام تھی......

''وہ چوری چھپے عشق معشوقی کرتی رہی تھی۔ ماں باپ نے رشتے سے انکار کر دیا تو بھڑک کر لڑکے نے تیزاب پھینک دیا۔ غیرت مند باپ نے لڑکے کو قتل کر کے خود کو بھی ختم کر لیا۔'' یہ کہانی باقی رہ گئی تھی' باقی سب ختم ہو چکا تھا۔ دنیا کو کڑوے سچ سے نہیں' چٹخارے دار جھوٹ سے مطلب ہوتا ہے......بس......

یوسف تین بہنوں کو اکلوتا بھائی' ماں باپ کی بڑھاپے کی اولاد تھا۔ اس کی بہنوں کے بچے اس سے عمر میں دو تین سال بڑے تھے۔ سالوں سے اس کے تایا' چچا تو یہ حساب کتاب لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ اب جائیداد تینوں بیٹیوں کے حصے میں ہی آئے گی' اسی لیے انہوں نے بیٹیوں کے رشتے لیے تھے۔ لیکن یوسف نے حساب کتاب میں گڑبڑ کر دی تھی۔ لمبے وقت کی چال کو' عین وقت پر الٹ دیا تھا......

سارا شریکا اس ملی بھگت میں شریک تھا۔ تایا' چچا اور تینوں بہنوئی۔ بہنوں کو خبر بھی نہیں ہوئی اور سب نے مل کر وقت پر چال چل دی۔ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی سلامت رہی......

☆ ☆ ☆

اس کے علاج کے لیے اماں نے دکان کو بیچ دیا تھا۔ خاندان میں کوئی بھی اس کے علاج کے لیے ایک پھوٹی کوڑی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لوگ تو اس پر لعنتیں بھیج رہے تھے......اس کے علاج کے لیے دوا کا انتظام کیوں کرتے؟

وہ تکلیف کی شدت سے ایسے چیختی' چلاتی اور کراہتی تھی کہ محلے والے اس سے عاجز آ چکے تھے۔ وہ گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر واویلا کرتے' انہیں شرم دلاتے کہ خدا کے لیے یہ گھر' یہ محلّہ چھوڑ دو......جان چھوڑ بھی دو ہم سب کی......''

وہ اپنی جان بھی چھوڑ دیتی لیکن اس کا کسی شے پر کوئی اختیار ہی نہیں تھا۔ دکان تو سیل ہو گئی تھی لیکن گھر نہیں ہو رہا تھا۔ اماں بے چاری خاندان والوں' محلے والوں کے سامنے ہاتھ جوڑ جوڑ کر روتی تھی......

''اور کچھ نہیں تو ترس ہی کھا لو میری صالحہ پر۔ کیسے تکلیف سے مچھلی کی طرح تڑپتی ہے وہ......''

''تو اپنے کرتوں کی سزا بھگت رہی ہے......توبہ کرے......توبہ......''

''توبہ کر کے' اس جگہ سے ہجرت کر لینی چاہیے' جس جگہ لوگوں کے دل پتھر' اور عمل سیاہ ہو جا چکے ہو۔''

چاچا امام دین نے آ کر اماں سے بس اتنا کہا تھا اور ان کا تھوڑا بہت سامان سمیٹ کر انہیں اس گھر میں لے آئے تھے۔ گھر اجاڑ اور ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔ لیکن اس کے آگے پیچھے احاطے بہت بڑے بڑے تھے کہ اس کی چیخیں اور کراہیں گھر سے باہر نہیں جاتی تھیں۔

زندگی کی نبض پر بس ایک ہی احساس غالب تھا......درد......درد......درد......

اس درد کے ساتھ اسے بہت سے غم مل گئے تھے۔ ایک محبت کے ساتھ اسے سو لعنتیں ملی تھیں۔ باپ کی موت کے ساتھ تسلی دلاسوں کی بجائے بدکرداری کی تہمتیں ملی تھیں۔ وہ لوگوں کے لیے دو کوڑی کی ہو چکی تھی۔ اس کے باپ کی کمائی ساری عمر کی عزت' خاک ہو چکی

تھی۔

خوب صورت آنکھوں والی کی ایک آنکھ کی بینائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی تھی' دوسری کی دھندلا چکی تھی۔ تیز رنگ اس آنکھ کو تکلیف دیتے تھے۔ وہ تقریباً کلر بلائنڈ ہو چکی تھی۔ دو ہی رنگ اسے سکون دیتے تھے...... ''سفید اور نیلا''

آسمانی رنگ......آفاقی رنگ......

☆ ☆ ☆

صبح پچھلے صحن میں صالحہ مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی' اور وہ تینوں اسے کھڑکی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے زندگی میں اتنا پُرسکون چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے اس گھر جتنا خوبصورت گھر بھی کہیں نہیں دیکھا تھا۔ زندگی کا کچھ حصہ اگر جہنم ہے' تو اس کی پوری زندگی جہنم تھی......پھر بھی وہ زندہ تھی......نہ گلے میں پھندہ ڈالا' نہ بلندی سے کود جانا چاہا......لوگ اسے کالے منہ والی کہنے لگے تھے۔ اس کے پاس مرنے کے ہزار بہانے تھے۔ پھر وہ زندہ کیوں رہی؟

''اس واقعہ کے بعد......کتنی تکلیف رہی تھی......'' طلال کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کن الفاظ میں سوال کرے۔

وہ ہنس دی......''کبھی ابلتے ہوئے تیل میں انگلی ڈبوئی ہے؟؟''

طلال کا سانس سینے میں اٹک گیا۔ ''علاج کے باوجود تکلیف رہی؟''

''علاج؟؟'' وہ پھر سے ہنس دی۔ ''جب آگ بھڑکتی ہے تو اسے ٹھنڈا ہونے میں بہت وقت لگتا ہے۔ آگ بجھ بھی جائے تو کوئلے سلگتے رہتے ہیں......سلگتے رہتے ہیں......''

''تم بہت باہمت ہو لڑکی ہو......م......مم......میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟''

''ایک بار مسکرا دیں......اتنا کر سکتے ہیں؟''

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ مسکرا نہیں سکا لیکن آبدیدہ ہو چکا تھا......

''میں بہادر نہیں تھی طلال صاحب! میرے رونے چیخنے چلانے سے اماں کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ابا بھی میری وجہ سے چلے گئے۔ اب اماں کو اپنی وجہ سے کچھ ہونے نہیں دینا چاہتی تھی۔ تو میں نے ہر روز ایک چیخ' ایک تکلیف دبانے کا فیصلہ کرلیا۔ گھر کی دیواروں پر نقش بنانے شروع کر دیے تھے۔ لیکن زیادہ فرق نہیں پڑ رہا تھا......چند دن کوشش کرتی رہی......پھر دل میں خیال وارد ہوا کہ،

''اس کی یاد میں ڈوب کر خود کو بھول جاؤ' جو بھٹکے ہوؤں کو بھی نہیں بھولتا......''

''تو مجھے خود کو بھلا کر' مٹا کر اس کی یاد میں منہمک ہونا تھا۔ اب میں ہر روز ایک آیت یاد کرتی' اسے دہراتی رہتی' دہراتی رہتی کہ میں بھول جاتی کہ میں کون ہوں' کہاں ہوں۔ میں نے پیالوں کے پیندوں پر ان آیتوں کو لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک......دو......تین مہینے گزر گئے......یاد کرتی جاتی' لکھتی جاتی۔ دن بدل گئے......وقت بدل گیا......وہ تو سماں ہی اور ہو گیا پھر......

''تکلیف بھول گئیں......؟؟

''اپنا آپ بھول گئی۔ درد جسم میں موجود ہو تو ہو' لیکن اس کی موجودگی کا احساس مٹ گیا تھا۔''

''اور لوگ...... معاف کر دیا انہوں نے......''

''لوگ کہاں معاف کرتے ہیں جی! انسان تو پتھر ہے' اللہ اس پتھر میں رحم ڈالتا ہے۔ پتا نہیں کیسے ایک بچی گھر آئی' وہ یہاں وہاں کھیلتی کودتی رہتی تھی۔ ادھر ادھر پیالے رکھے تھے' ان میں کھاتی پیتی رہتی تھی۔ اسے مرگی کا مرض تھا۔ پھر پتا نہیں چلا کیا ہوا' کیسے ہوا' ادھر ادھر سے لوگوں نے آنا جانا شروع کر دیا۔ کوئی بچہ لے آتا' کوئی بچی...... ایک دن ایک دکان دار آیا' بیس بائیس پیالے اٹھا کر لے گیا۔ آہستہ آہستہ دوسرے دکان دار بھی آنے لگے۔ ان کی مانگ بڑھ گئی۔ کوئی انہیں آسانی پیالے کہتا ہے کوئی رحمانی۔

انسان کے بس میں کہاں ہے کہ وہ اللہ کے نظام اور اختیار کو سمجھ سکے۔ جس چہرے کی طرف دیکھ کر لوگ تھوکتے تھے' اس کے پاس آ آ کر اپنی تکلیفیں بتانے لگے۔ میرا نام صالحہ سے صالحہ نور ہو گیا اور اماں کا میرے نام کی نسبت سے اماں نوری...... مجھے تو پہلے بھی نہیں پتا چلا تھا کہ میں لوگوں کو بری کیوں لگنے لگی ہوں۔ مجھے اب بھی پتا نہیں چلا کہ لوگ مجھے پسند کیوں کرتے ہیں۔

''تو ان پیالوں میں شفاء ہے......؟''

''کبھی دوا میں شفاء ہوئی ہے طلال صاحب؟ بے جان چیزوں میں شفاء کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ تو اختیار والے کے کمال کا کمال ہے بس۔ اس نے چاہا کہ نیلی روشنائی ''شفاء'' ہو جائے اور وہ ہو گئی۔ انسان پر یہ احسان کیا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھوں کمال کروا دیا جاتا ہے۔ ہم متکبر ہیں' اور بے وقوف بھی۔ اللہ کے احسانوں کو اپنا کمال کہتے...... اسی لیے اللہ کا ارشاد ہے،

''اور انسان بہت احسان ناشناس ہے۔'' (القرآن)۔

طلال دنگ اس کے پرسکون چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ''تمہاری سمجھ بوجھ مجھے شرمندہ کر رہی ہے......''

''میری عظمت کے گن نہ گائیں۔ شروع شروع میں' میں بہت روتی تھی۔ پاگل ہو گئی تھی۔ اپنے حسن کے گہن پر بہت ماتم کیا تھا میں نے۔ بہت روئی تھی میں۔ پھر ایک خیال الہام ہوا کہ ''جس کا ایمان سلامت ہے' اس کا سب سلامت ہے۔ حسن کو باہر کہاں ڈھونڈ رہی ہو؟ ذرا اندر جھانکو۔'' میں نے اندر جھانکا تو مجھے میرا حسن مل گیا...... ''میرا ایمان...... میرا رب......'' میرا آپ کا' ہم سب کا یہی تو حسن ہے۔ ہم کہاں کھال بال میں الجھے ہیں۔ ایک این جی او مجھے سرجری کے لیے باہر بھجوا رہی تھی' پر میں نے اپنی جگہ دوسری لڑکی کو بھیج دیا۔ دیکھیں نا میں دیکھ سکتی ہوں' سن اور بول سکتی ہوں' اور انسان کو کیا چاہیے۔ کھال کو چمکا کر کیا کروں گی...... ظاہری حسن کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے بھلا؟

''تم نے اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا؟''

''وہ میرے دشمن نہیں ہیں' خود اپنے دشمن ہیں۔ جب انسان کسی کے ساتھ برا کرتا ہے تو وہ دراصل اپنے ساتھ برا کرتا ہے۔ بھلا جو انسان اپنے لیے آگ اکٹھی کر رہا ہو وہ کسی کے ساتھ کیا برا کرے گا......؟؟''

''اور محبت......؟؟'' اسے شدت سے اس سوال کے جواب کی ضرورت تھی۔

''جب یہ جان لیا کہ حقیقی محبت کیا ہے تو پھر مجازی محبت کا سوگ ختم کر دیا۔ یہ سب ایسے ہی ہونا تھا' ہو گیا۔ باہر سے آنکھیں بند کیں تو اللہ نے اندر چراغاں کر دیا۔ سب سوال مٹا دیئے' تو جواب خود بخود نکھر کر سامنے آ گئے......''

''جواب......؟؟''

''ہاں جواب کہ...... تکلیف کے راستے روشنی ملتی ہے......اور روشنی کے راستے ''نور''......''

☆ ☆ ☆

فرنٹ سیٹ پر بیٹھے طلال نے کھلی کھڑکی میں رکھے بازو پر اپنا سر رکھا اور باہر کے نظارے دیکھنے لگا۔

وہ یونیورسٹی کے پہلے دن' پہلی کلاس' پہلی نظر میں اریبہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ بے حد حسین تھی اور ڈیپارٹمنٹ میں غیر معمولی طور پر مقبول بھی۔ وہ گھر تک اس کا پیچھا کرتا تھا...... اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے وہ سنڈے کو بھی اپنے گلبرگ کے بنگلے سے 'روای پار کر کے اس گندے سندے علاقے میں جایا کرتا تھا۔ اس کے فرینڈز کہتے تھے کہ وہ ایک معمولی سی لڑکی کے لیے خود کو خوار کر رہا ہے۔

''میرے لیے اس کے سوا یہ ساری دنیا معمولی ہے...... بے کار اور بے وجہ......'' وہ ہنس کر کہتا

''مجھ سے دور رہنا۔ لفٹ لینے اور لائن مارنے کا یہ گھسا پٹا انداز مجھ پر اپلائی نہ کرنا۔ نہ میں لائن میں آؤں گی نہ کسی سچی جھوٹی محبت کے چکر میں...... سمجھے......''

وہ ناسمجھی سے اسے دیکھ رہا تھا جو اتنی سختی سے اس سے بات کر رہی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ میں مشہور تھا کہ وہ کسی سے محبت کرتی ہے اسی لیے کسی دوسرے لڑکے کو گھاس نہیں ڈالتی۔ اس کا کوئی بچپن کا منگیتر ہے' جس کے لیے وہ ساری دنیا کے لڑکوں کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہے۔

اس نے اپنی جوتی بدل لی تھی یا خیال' لیکن تیسرے سمسٹر میں وہ خود ہی اس کی طرف کھنچی چلی آئی تھی۔ شاید اسے اس کی محبت پر یقین ہونے لگا تھا۔ وہ اس سے لفٹ لینے لگی تھی۔ لنچ' ڈنر اور شاپنگ۔ پھر وہ اس کے گھر والوں سے ملا اور اپنے گھر والوں کو اس کے گھر بھیج دیا۔

ان کی منگنی ہوئی۔ نکاح اور پھر شادی ہو گئی۔ ڈیڑھ سال تک وہ ''سچی محبت'' کے حصار کا قیدی بنا رہا تھا۔ اس سچی محبت کے لیے اس نے ہر قیمت ادا کی تھی۔ ماما کو اریبہ پسند نہیں تھیں' اور اریبہ کو ماما۔ اس نے اسے الگ گھر لے دیا تھا۔ اس کے کہنے پر پاپا سے اپنا بزنس الگ کر لیا تھا۔ سارے بینک اکاونٹ اریبہ کے ساتھ جوائنٹ کر لیے تھے۔ وہ اس پر اپنا دل ہار اتھا' بدلے میں ہر قیمتی چیز سے اسے جیت لینا چاہتا تھا......

اگر انسان دانائی لے کر دنیا میں چلے پھرے' اور سچی محبت کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے تو اس پوری دنیا میں شاید ہی چار' پانچ لوگ سچی محبت کے امین ملیں۔ آدھی دنیا دھوکے میں' زیادہ جھوٹ میں' اور باقی ماندہ غلط فہمی کی محبت میں مبتلا ملے گی۔ ماں کی محبت کے علاوہ انسان شاید ہی کبھی ''سچی محبت'' کا مزہ چکھ سکے......

اس رات کے دن وہ میٹنگ کے لیے دبئی گیا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس نے لینڈ کیا' اسے مطلع کیا گیا کہ میٹنگ کے لیے آنے والے

ڈیلیگیشن کے ہیڈ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔وہ آئی سی یو میں ہے۔

میٹنگ کینسل ہو چکی تھی۔اس نے اریبہ کے لیے شاپنگ کی اور رات کی فلائٹ سے واپس آ گیا۔

'بی بی گھر نہیں ہیں؟''وہ ٹیکسی سے آیا تھا۔انٹرنس ڈور لاک تھا۔اس نے گردن موڑ کر گارڈ کی طرف دیکھا۔

گارڈ نے نظریں چرا لیں۔''گھر ہی ہیں جی وہ......''

''تو یہ لاکڈ کیوں ہے......کوئی ملازم نہیں ہے اندر؟''

''سب ملازموں کو چھٹی دے دی تھی جی......بس وہ ایک رقیہ......''

وہ حیرت سے گارڈ کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔پورچ میں ایک کار کھڑی تھی۔یہ کار اریبہ نے اپنے بھائی کو گفٹ کی تھی۔وہ انٹرنس ڈور پر ہاتھ سے دستک دینے لگا تو جرات کر کے گارڈ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔اس نے حیرت سے گارڈ کی طرف دیکھا۔

جس وقت وہ بیڈ روم کی پچھلی کھڑکی سے اندر گیا'اسے اس وقت بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے' کیوں کر رہا ہے۔وہ پاگل یا بے وقوف نہیں تھا۔اسے اریبہ پر ایمان کی حد تک یقین ہے۔ساری دنیا اکٹھی ہو کر آ جاتی تو بھی وہ......

ساری دنیا خاک ہو چکی تھی......دل کی دنیا ڈھول مٹی......

☆ ☆ ☆

وہ جانتا تھا کہ پیسہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کہیں نہ کہیں اریبہ اس کے اسٹیٹس سے متاثر تھی۔اس نے تو اریبہ سے محبت کی شادی کی تھی'لیکن اریبہ نے اور بھی بہت کچھ دیکھ کر شادی کی تھی۔وہ اتنا سب کچھ جانتا تھا......

لیکن یہ اس نے بعد میں جانا تھا کہ اس کی اتنی بے تحاشا محبت پر بھی اس کی بیوی تخفے میں اسے دھوکا دے رہی تھی۔جب وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈالتی ہے یا اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے تو وہ اچھی اداکاری کرتی ہے۔اس نے سچی محبت نہیں پائی تھی'اس نے اچھی اداکارہ پائی تھی......بس......

محبت تو وہ اس سے کرتی تھی'جس کے لیے وہ اپنے شوہر کے بینک اکاونٹ خالی کرتی جا رہی تھی۔جسے وہ کار اور فلیٹ گفٹ کر چکی تھی۔جس کے ساتھ وہ شاپنگ پر جاتی تھی۔جس کے ساتھ وہ ایک بار سنگاپور بھی جا چکی تھی۔

''تمہیں دولت چاہیے تھی تو مانگ لیتیں......''وہ صوفے پر سر جھکا کر بیٹھا اپنے جسم کی کپکپاہٹ کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم دے دیتے؟؟''وہ بے شرمی سے گردن تان کر پوچھ رہی تھی۔

''ہاں دے دیتا......تم پیسہ مانگ لیتیں لیکن مانگے بغیر مجھے یہ دھوکا نہ دیتیں......''

''ہونہہ!تو اب دے دو......اپنا سب کچھ دے دو اور طلاق بھی......''وہ ابھی بھی اس کی محبت کا ثبوت مانگ رہی تھی۔

'میری محبت میں ایسی کیا کمی ہے......؟؟م......م......''اس کا اپنی سمت اٹھا ہاتھ بڑا کمزور اور ناتواں ہو گیا۔

''تم ہو کون؟؟تم تو اس کے پیروں کی خاک بھی نہیں ہو۔''محبت ہی اتنا بے خوف بناتی ہے۔وہ بے خوفی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ دنگ اپنی بیوی کی شکل دیکھ رہا تھا...... پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا اور پھر ایکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

محبت......اس نے تو اس پر اپنا سب کچھ وار دیا تھا......

محبت......اس نے بھی پلٹ کر ”کار وار“ کیا تھا......

☆ ☆ ☆

اسے نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔وہ ابھی ہاسپٹل میں ہی تھا کہ اریبہ اپنی محبت کے ساتھ ملک سے ہی باہر چلی گئی تھی۔بینک اکاؤنٹ اس نے خالی کر دیے تھے۔گھر اور بزنس کے شیئرز سیل کر دیے تھے۔

اس کے زخم بھر رہے تھے۔وہ نارمل لائف کی طرف آ رہا تھا۔صبح اٹھتا' جوگنگ کرتا' جم جاتا' پھر پاپا کے ساتھ آفس۔رات کا ڈنر وہ سب مل کر کرتے۔کافی کے ساتھ کچھ دیر بزنس کے معاملات ڈسکس ہوتے...... پھر نیند کی گولیاں کھا کر وہ سو جاتا......

آہستہ آہستہ نیند کی گولیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔پھر سرے سے نیند ہی غائب ہو گئی۔وہ سکائٹرسٹ پر سکائٹرسٹ بدلنے لگا۔ڈیپریشن بھی اپنے لیول بدلنے لگا۔وہ پہلی سے دوسری اسٹیج کی طرف جانے لگا۔بظاہر وہ نارمل نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں پوری طرح سے ابنارمل تھا......

”تم ہو کون......؟؟“ وہ جب بھی خود کو مرر میں دیکھتا اسے یاد آتا۔

”میں کون ہوں؟“ وہ خود سے پوچھتا...... گھنٹوں مرر کے سامنے کھڑا رہتا۔دنیا کے بدصورت ترین انسان کو دیکھتا رہتا۔

”تم تو اس کے پیروں کی خاک بھی نہیں ہو۔“

اس نے گھر کے سارے آئینے توڑ دیئے۔وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔چیخنے چلانے لگا۔دیواروں سے سر ٹکرانے لگا۔خود کو زخمی کر لیا۔گھر کے نو ملازموں کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

پھر ایک دن وہ پنکھے سے لٹکتا ہوا ملا۔ملازم نے بروقت آ کر اسے پیروں سے اُٹھا کر اوپر کر لیا تھا۔اور پھر وہ مینٹل ہاسپٹل آ گیا۔

دنیا کا سب سے زہریلا زخم ”بے وفائی“ کا زخم ہوتا ہے۔دنیا کی سب سے گہری چوٹ ”محبت کی چوٹ“ ہوتی ہے۔

☆ ☆ ☆

”یہ چاچا امام دین ہیں یا چاچا تارڈ دین؟ یہ ایک جگہ ٹک کر کیوں نہیں بیٹھتے بھئی! جہاں جاؤ' وہاں سے آگے نکل چکے ہوتے ہیں۔“ ڈرائیونگ ہادی کر رہا تھا۔جھنجھلا بھی وہی رہا تھا۔

لگتا ہے یہ چاہتے ہیں کہ ہم مرنے سے پہلے سارا پاکستان گھوم پھر لیں......“ ابراہیم نے ہنس کر کہا۔

”مرنے“ کے لفظ نے کار کے اندر سناٹا طاری کر دیا...... انہیں یاد آیا کہ انہیں تو مرنا ہے۔

”اب چکوال جانا ہے' دیکھو وہاں بھی ملتے ہیں یا نہیں...... یہ نا ہو کہ وہاں جا کر معلوم ہو کہ کے ٹو جاؤ۔دیکھو' اگر ایسا کچھ ہوا تو میری طرف سے صاف انکار ہے یاروں! مجھے نہیں جانا کے ٹو۔“ طلال نے کار کے سناٹے کو معطل کرنا چاہا۔

''سنا ہے وہاں جا کر خون جم جاتا ہے۔ انگلیاں جھڑ کر گر جاتی ہیں.....'' ہادی نے ٹھوڑی کو کھجاتے ہوئے پوچھا۔

''لیکن تمہاری پہلے زبان جھڑ کر گرے گی' قینچی کی طرح چلتی ہے خیر سے.....''

کہہ کر کار کا دروازہ کھول کر ابراہیم باہر نکلا۔ اسے ایڈریس کنفرم کرنا تھا۔ صالحہ نور نے انہیں ایک چھوٹا سا کام کہا تھا' وہ اسی کام کے لیے اس طرف آئے تھے۔

ملازم انہیں باغ میں بٹھا کر اندر بتانے چلا گیا تھا۔

''کس چیز کی کمی ہے یار یہاں؟ بڑی عجیب سی جگہ لگ رہی ہے.....'' ہادی نے تین ایکڑ پر پھیلے فارم ہاؤس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ابراہیم سے پوچھا۔ سبزا' درخت' پرندے سب کچھ تھا وہاں لیکن پھر بھی ہر طرف بوجھل پن تھا۔

''کمی نہیں زیادتی ہے.....وحشت کی.....دل چاہ رہا ہے اٹھ کر بھاگ جاؤں.....'' ابراہیم نے کہا

''ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا!'' خاتون کی افسردہ سی آواز آئی اور وہ ان کے سامنے آ کر بیٹھ گئیں۔ ''وحشت ہی وحشت ہے یہاں ہر طرف۔''

ابراہیم گڑبڑا گیا۔ کارٹن کھول کر ان کے سامنے کیا۔

''یہ ہم آپ کے لیے لائے ہیں۔ اس پیالے میں بیمار کو کھانے پینے کی چیزیں دینی ہیں اور اس والے میں پینے کا پانی۔''

اب انہوں نے ذرا سا چونک کر تینوں کو دیکھا.....ہاتھ بڑھا کر پیالے نکال کر ہاتھوں میں لے لیے.....

''تم ملتان سے آئے ہو؟؟ صالحہ نے بھیجا ہے تمہیں.....؟؟

''جی.....''

کتنی ہی دیر تک وہ آنسو بہاتی رہیں۔ فارم ہاؤس کی وحشت بڑھنے لگی.....ہادی نے اشارہ کیا کہ چلو چلیں بس۔

''پنڈی جا رہے تھے' پتا نہیں کیسے ان کی جیپ نے آگ پکڑ لی۔ کہتے ہیں آگ کا جلا نہیں بچتا لیکن یہ بچ گئے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں دل' گردے' پھیپھڑے' سب سلامت ہیں' بس کھال.....وہ ایسے جھلس گئی ہے کہ انہیں کسی پل چین نہیں آتا۔ بہت چیختے چلاتے ہیں۔ اسی لیے تو اس ویران جگہ آ کر رہنے لگی ہوں۔ اپنے بیٹوں اور بھائی کو بھی بہت یاد کرتے ہیں۔

سارا خاندان اجڑ گیا ان کا۔ چھوٹا بھائی کار کے حادثے میں فوت ہو گیا۔ میرے ہیرے جیسے بیٹے دریا میں ڈوب گئے۔ بھائی قتل ہو گیا۔ ماں باپ بیٹے کے غم میں مر گئے۔ چھوٹی بہن بیوہ ہو گئی۔ مجھے کس بات کی سزا ملی؟؟''

خاتون اپنا دل ہلکا کر رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''صالحہ نور آپ کی کیا لگتی ہیں.....؟؟'' طلال نے رک کر پوچھا۔

''اگر شادی ہو جاتی تو وہ میری بھابھی ہوتی.....'' اب وہ باقاعدہ رونے لگی تھیں۔

تینوں سناٹے میں آ گئے.....صالحہ نور نے اس شخص کے لیے پیالے بھیجے تھے.....

''کیا صالحہ نے ہمیں معاف کر دیا ہے؟'' وہ سسکتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔
''معاف نہ کیا ہوتا تو شفاء کیوں بھیجتی؟''

☆ ☆ ☆

طلال نے سڑک کے کنارے بنے چھوٹے سے کھوکے کے قریب کار روک کر' چاچا امام دین کے ٹھکانے کے بارے میں پوچھا۔ کپ سے پرچ میں چائے انڈیل انڈیل کر ''سڑکا'' لگاتے بزرگوار نے جلدی سے ہاں میں سر ہلایا۔

''میں جانتا ہوں......'' اب وہ چائے میں کیک رسک ڈبو کر کھا رہے تھے۔

''بتا دیں پھر......'' ہادی اتنا ندیدا تھا تو نہیں لیکن وہ چائے اور کیک رسک کو دیکھنے لگا۔

''بتانے سے نہیں ملیں گے وہ' ساتھ لے کر جانے سے ملیں گے۔ آؤ چائے پی لو...... گڑ چائے...... آ جاؤ شاباش......''

بارش ہو تو درخت پودے' سبز انکھر کر گہرا سبز ہو جاتا ہے نا۔ یہ علاقہ ویسا ہی تھا۔ ہوا میں نمی تھی جیسے کچھ دیر پہلے بارش ہوئی ہو۔ اونچے نیچے راستے' ٹیلے' چڑھائیاں' اور سبزے کے میدان۔ درخت اتنے کہ گماں ہوتا تھا کہ قریب ہی کہیں ایمزون جنگل کی چھوٹی بہن واقع ہوئی ہے۔ دور پہاڑ دکھائی دیتے تھے کہ ذرا چلیں گے کہ تو بس قریب ہی آ جائیں گے۔ ہوا بہت پر جوش اور خوش امید تھی۔

کھوکھا تیلی سڑک کے اس طرف تھا۔ کھوکھے کے پیچھے بڑا اور لمبا پانی کا تالاب تھا۔ الٹی چھلانگیں لگا لگا کر لڑکے اس میں کود رہے تھے' نہا رہے تھے۔ چائے کی ''سڑک سڑک'' کے ساتھ ''شڑاپ شڑاپ'' کی آوازیں ماحول میں رنگ بھر رہی تھیں۔

بابا جی نے انہیں گڑ چائے کو پرچ میں انڈیل کر ''سڑکا'' لگانے کا مشورہ دیا۔ اور demo دے کر بھی دکھایا۔ تینوں نے کپوں سے چائے پرچوں میں انڈیل کر زوردار ''سڑک'' ماری اور بابا جی نے تالی۔

''یہ ہوتا ہے اصل طریقہ چائے پینے کا...... شہر سے آئے ہو؟؟

لکڑی کے بینچ پر اسکول کے بچوں کی طرح شرافت سے بیٹھے' پرچ کو ہونٹوں سے لگائے انہوں نے ایک ساتھ ہاں میں سر ہلایا۔

''چاچا امام دین کے یہاں چھٹیاں گزارنے آئے ہوگے۔ کالجوں میں چھٹیاں ہوگئی ہیں نا......''

''ہم مینٹل ہاسپٹل سے چھوٹ کر نکلیں ہیں......'' ابراہیم زیر لب بڑبڑایا تو ہادی کا چائے کا گھونٹ پھوار بن کر باہر برس گیا۔ طلال کو ہلکا سا پھندا لگا۔ اس نے ہاتھ پیچھے لے جا کر ابراہیم کی کمر پر مکا مارا۔

''تم ذرا چپ نہیں رہ سکتے۔''

ابراہیم نے پرچ سے آخری گھونٹ سڑکا اور اپنا گولڈ میڈل مکا طلال کی کمر پر رکھا۔ ''اب چپ ہو جاتا ہوں بھائی جان!''

''بہن بھائیوں نے چائے پی لی ہے تو چلیں......؟؟ بابا جی کے کان بہت تیز تھے۔

بہن ابراہیم نے شرٹ کے بازو فولڈ کیے' چھپر میں نہانے والے بچوں کو ایک نظر دیکھا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

''ٹھیک سے گاڑی چلا لیتے ہو نا؟؟'' بابا جی خود ہی فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔

ابراہیم زیرِ لب ہنس دیا۔ ''میں چار شہر بھگتا کر آ رہا ہوں جی۔''

''وہ اور بات ہوتی ہے......'' بابا جی کھی کھی کرنے لگے۔

سانپ کی طرح لمبی پتلی لہراتی ہوئی سڑک تھی۔ آس پاس کا نظارہ بہت خوبصورت تھا......اور پیچھے کا بھی...... جہاں سے دس گیارہ سالہ بچی اپنی گھوڑا گاڑی پر طوفان مچاتی آ رہی تھی۔ لگامیں پکڑ کر کھڑی تھی اور گھوڑے کو پتا نہیں کیا کیا کہتی جا رہی تھی۔ وہ پیچھے کہیں سے کار کے ساتھ اپوں آپ ہی ریس لگاتی ہوئی آ رہی تھی۔ تھوڑا سا ہانپ بھی رہی تھی۔ اب وہ ریس لگا رہی تھی تو اس نے بھی کار کی سپیڈ بڑھا دی۔ ادھر سپیڈ بڑھی تو ادھر بھی بڑھ گئی۔ وہ بڑا حیران ہوا' یعنی گھوڑا گاڑی پر وہ اس کی کار سے ریس لگا رہی تھی...... بچے بھی کیسی کیسی بچکانہ حرکتیں کرتے ہیں...... اس نے رفتار اور بڑھا دی' اس نے بھی ہار نہیں مانی۔ پتا نہیں کس زبان میں اس نے گھوڑے سے کچھ کہا کہ گھوڑا صرف گھوڑا نہ رہا...... وہ تو سیدھا ہوا سے باتیں کرنے لگا...... طلال کو شک ہوا کہ کہیں وہ ہوا میں اڑنے ہی نہ لگے۔

بابا جی نے کھڑکی سے سر باہر نکالا' اور ہانک لگائی۔ شاوا بچے! شاوا......''

اور سر اندر کر کے یہ۔ ''بیٹا جی! اب تم جیت کے دکھاؤ۔'' (دیکھو ذرا)

تینوں نے بابا جی کو حیرت سے دیکھا۔ وہ تو مذاق مذاق میں ریس لگا رہا تھا۔ کہاں اس کی کار اور کہاں اس کا مریل سا گھوڑا' اور ٹوٹی پھوٹی گاڑی...... پھر بھی اب تو بات ہی عزت پر آ گئی تھی۔ پیچھے سے ہادی نے گردن کو سیٹ کے درمیان پھنسا دیا تھا اور اس کے اوپر طلال نے...... ریس باقاعدہ شروع ہو چکی تھی......

''یار او یار...... سپیڈ بڑھا...... سپیڈ......'' ہادی نے لڑکیوں کی طرح اس کے بالوں میں ہاتھ ڈال کر کھینچا۔

''او بھائی کار ہے یہ' جہاز نہیں......'' ابراہیم کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بچی آخر گھوڑے سے ایسا کہہ کیا رہی ہے کہ وہ بھڑک کر سپیڈوں سپیڈوں دوڑا جا رہا ہے۔

''تو اس کے پاس کون سا ہیلی کاپٹر ہے...... ایک مریل سا گھوڑا ہی تو ہے......''

''غور سے دیکھ بھائی وہ گھوڑا ہی ہے نا؟؟'' طلال نے ابراہیم کو چڑانا چاہا......

''لگ تو گھوڑا ہی رہا ہے...... ویسے میں نے کبھی لائیو دیکھا نہیں لیکن کیا گھوڑے ایسے دوڑتے ہیں......؟''

ان کی کار میں بیٹھ کر' بابا جی ان ہی کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ابراہیم نے خائف نظروں سے بابا جی کو دیکھا۔

''شاوا بابا جی...... شاوا...... ہماری کار میں بیٹھ کر ہمارے ہی خلاف...... دیکھو ذرا......''

''سامنے دیکھ کر بیٹا جی! ویسے ہی تم ہار رہے ہو......'' بابا جی نے ونڈ سکرین کی طرف اشارہ کیا اور ہنس دیے۔ ہی ہی ہی۔

پہلے دس منٹ تو دونوں تقریباً برابر رہے۔ کبھی ذرا سا آگے' کبھی بس ذرا سا پیچھے۔ پھر ایکدم سے...... بالکل ایکدم سے بچی نے ''ہراہ'' کہہ کر لگام کو جھٹکا دیا...... گھوڑا' گھوڑا نہ رہا' راکٹ' میزائل' جہاز' باز' شاہین سب بن گیا...... یہ جا وہ جا......

پورے ایک منٹ' چالیس سیکنڈ تک ان کی کار گھوڑا گاڑی سے پیچھے رہی۔ بچی نے پھر انہیں سڑک پر راستہ ہی نہیں دیا۔ وہ ساری

سڑک پر مل مار کر اپنا گھوڑا دوڑاتی لہراتی رہی......

زندگی میں ان کا بہت کچھ ٹوٹا تھا' مان' دل' کبھی کوئی ہڈی وغیرہ' لیکن ایسے ان کا غرور نہیں ٹوٹا تھا۔ ایک دس سالہ بچی نے' گھوڑا گاڑی سے انہیں ہرا دیا تھا۔ کچھ ہاریں بہت مہنگی نہیں بہت سستی جگہ سے ملتی ہیں۔ کچھ تکلیفیں انجکشن کی سوئی کی طرح بڑی جان لیوا سی ہوتی ہیں......سی......آہ......ہائے......

جیسے مقابلہ کے اختتام پر کھلاڑی آمنے سامنے آ کر ہاتھ ملاتے ہیں۔ ویسے ہی بچی گاڑی سے کود کر ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ طلال کار کے بونٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ ہادی کار سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ ابراہیم سے ٹھیک سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ سہارے کے طور پر اس نے دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے......ہار سہارنا آسان نہیں ہوتا نا......

''اسلام علیکم جی......'' ہاتھ سر تک لے جا کر اس نے سلام کیا۔

''وعلیکم اسلام! شاباش' کس کلاس میں ہو؟'' طلال نے بونٹ پر بیٹھے بیٹھے تالی ماری۔ بچی کی جیت کے واضح آثار دیکھتے ہوئے اس نے سر کھڑکی سے باہر نکال کر سیٹیاں مارنی شروع کر دی تھیں۔ وہ بچی کو سپورٹ کرنے لگا تھا۔ ابراہیم نے جل کر اسے دیکھا اور پھر بچی کو جو بڑا کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ تیل لگا کر کس کر چوٹی بنائی ہوئی تھی۔ اپنے قد سے کئی گنا بڑا دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ پوری مائی پھتاں لگ رہی تھی۔

''پانچویں میں جی......'' اس مائی پھتاں نے دو ٹام کروزوں اور ایک گولڈ میڈلسٹ کو ہرا دیا تھا۔

ہادی لڑھکڑا کر گرتے گرتے رہا۔ شرارتاً کھانستے ہوئے مسکرانے لگا۔ ''تمہاری کیا عمر ہے ابراہیم؟ پانچویں پاس ہو نا تم؟''

ابراہیم نے جل کر چاروں کو دیکھا۔ پھتاں نے واپس گاڑی پر چھلانگ لگائی' لگام کھینچی' ہانک لگائی اور غائب ہو گئی۔

''کیسی رہی پھر ریس؟'' لو اب بابا جی زخموں کے لیے نمک' مرچ' ہلدی لے آئے تھے۔

''کار کی سروس نہیں ہوئی تو......ویسے بھی سائنس کے بقول جانور مشین سے زیادہ ہوشیار اور تیز رفتار ہوتا ہے۔'' (یہ سائنس صرف اس نے ہی پڑھی تھی)

''کوئی بات نہیں بیٹا جی! اس ہفتے کروا لیتے ہیں ایک ریس۔ ایک جیسے گھوڑے' ایک جیسی گاڑیاں۔ مشینوں کو دفعان کرتے ہیں۔ بولو اب ہاں؟؟''

''بول کے دکھاؤ اب ناں......'' ہادی نے اس کے شانے کو شانے سے ٹھوکا اور آنکھ ماری۔

''ہاں ہے بابا جی......ہاں ہی ہاں ہے......'' طلال نے ہاتھ اٹھا کر' ڈیل ڈن کی......

''بس پھر اس ہفتے......تین تم......تین ہماری بچیاں......''

''تین......؟؟'' طلال اور ہادی چونکے۔ وہ سمجھے بس ابراہیم کو للکارا جا رہا ہے۔

''ٹھیک ہے بابا جی! منظور ہے......منظور ہے......'' اب ابراہیم نے ہاتھ اٹھا کر ''ڈیل ڈن'' کی......

سیانے کہتے ہیں جو گڑھا دوسروں کے لیے کھودو' اس میں انسان خود گر جاتا ہے۔'' کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے دونوں کو سیانوں کی

بات یاد کروائیں......اور گڑھا......جس میں وہ سب ہارنے کے بعد گرنے والے تھے......شرم سے......

☆ ☆ ☆

چھوٹا سا ہنستا بستا گاؤں تھا۔ بہت ہی سادہ' اللہ لوک لوگ تھے۔ چند سال پہلے گاؤں کے ایک سیانے کو زہریلے بچھو نے کاٹ لیا تھا۔ وہ دلدلی جھاڑیوں میں زندگی و موت کی جنگ لڑ رہے تھے کہ اسکول سے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ آتی سارہ نے چاچے کو زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ لیا۔

گاؤں تو بہت دُور تھا' جیسے تیسے تینوں نے مل کر' چاچے کو گاڑی میں لٹایا اور سارہ نے گھوڑے کی لگاموں کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس نے شہر کی سڑک پر وحشت ڈال دیا تھا۔ کسی بس' ٹیکسی' کار کو گزرنے نہیں دیا تھا اور چاچے کو ڈسپنسری پہنچا کر ہی دم لیا تھا......

اس سے پہلے گاؤں والوں کو سارہ کے گھوڑا گاڑی دوڑائے پھرنے پر بڑا اعتراض رہا کرتا تھا۔ سیانے کہتے تھے وہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو بھی خراب کر دے گی......

اس نے گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو بھی اپنی طرح کا کر دیا تھا۔ چاچا اللہ بخش نے ہسپتال سے آتے ہی سب سے پہلے اپنی تینوں بیٹیوں کو اس کی طرح گھوڑا گاڑی دوڑانا سکھایا تھا۔ پھر گاؤں بھر میں ہوا چل پڑی تھی۔ ہر بچی اپنے باپ' بھائی' چاچے' ماے کی گھوڑا گاڑی کو اپنی سواری سمجھتی تھی۔ لڑکیوں کو سواری پر سوار ہونا بھی آنا چاہیے' اور سواری چلانا بھی......وہ گھوڑا ہو' کار یا جہاز......

☆ ☆ ☆

بابا شاہ' انہیں چاچا امام دین کے پاس اس ریس کے بعد ہی لے کر جانا چاہتے تھے۔ انہیں ان کے گھوڑے اور گاڑیاں دے دی گئیں کہ وہ پریکٹس کر لیں......

''ہم بچیوں سے ریس لگاتے ہوئے اچھے نہیں لگیں گے بابا جی!'' طلال نے اپنی طرف سے ریس سے برطرف ہونا چاہا۔

''ڈر گئے ہو؟''

''ایسے ہی وہ ہار گئیں تو ان کا دل برا ہوگا......ہو سکتا ہے وہ روئیں بھی......''

''تم اس دن ہار گئے تھے تو روئے تھے؟؟ ان میں اسپورٹس مین شپ ہے۔ سمجھے......'' بابا جی کو تو انگلش بھی آتی تھی۔ ''ہمیں اور ہمارے گاؤں کو ایویں کیویں نہ سمجھنا۔ پوری طرح سے ریس کی تیاری کرو شاباش! پورا پورا مقابلہ ہوگا......''

''پورا پورا مقابلہ......وہ بھی ہم مرے ملوں سے......'' تینوں کچھ فکرمند سے تھے۔

وہ صبح سویرے اپنی گھوڑا گاڑیوں پر نکلتے اور پریکٹس کرتے۔ شروع میں عجیب لگا پھر اچھا لگنے لگا۔ انہیں احساس ہوا کہ یہ ایسے ہی جیسے ہوا میں اڑنا۔ جیسے ہر بوجھ سے آزاد ہو جانا۔ جیسے زمین کی حیات اور کائنات کی گردش کا حصہ بننا۔ گھوڑے بھی تھوڑی بہت ان کی زبان سمجھنے لگے تھے۔ لگاموں پر گرفت مضبوط ہونے لگی تھی۔

''تم گھوڑے سے کچھ کہتی تھی اور وہ تیز دوڑنے لگتا تھا۔ کیا کہتی ہو تم؟'' ایک دن وہ مائی پھتاں سے ٹپس لینے لگے۔ بچی نے زبان

کو رول کر کے حلق سے کچھ آوازیں نکالیں جو کوشش پر بھی ان سے نہیں نکالی گئیں۔

''تم کہتی کیا ہو' بس وہی بتا دو......''

''اوئے شیرا' چل اُڑ کے وکھا...... چیتا بن' چیتا...... شاوا میرے ککڑ' شاوا......''

گھوڑا تے اوتوں شیر...... نالے چیتا فیر ککڑ...... شاوا بھئی شاوا۔'' تینوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''گھوڑا مائنڈ نہیں کرتا کہ اسے شیر پھر ککڑ کیوں کہا؟؟ ویسے یہ دونوں ہی نہیں اُڑتے......'' ہادی نے سنجیدگی سے پوچھا اور بتایا۔

''گھوڑے کا مائنڈ اس طرح کی باتوں کو مائنڈ میں نہیں رکھتا۔ پھر اس نے کون سا شیر کو دیکھا ہوا ہے۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔

''تو وہ خود کو شیر سمجھ کر دوڑتا کیسے ہے...... جب دیکھا ہی نہیں تو؟'' طلال بھی کنفیوز تھا۔ وہ واقعی میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔

''کیونکہ وہ ہم انسانوں کی طرح بے کار کے سوالوں میں نہیں الجھتا۔ اب بھلا آپ میرا گھوڑا ہوتے تو سوال پوچھ پوچھ کر ہی میرا سر کھا لینا تھا۔ اسی لیے آپ گھوڑا نہیں بنے...... چچ چچ......''

''تمہیں گھوڑا ہم سے بہتر لگتا ہے......؟؟'' ابراہیم کو ہنسی آ گئی۔

''ہاں! وہ چپ چاپ دوڑتا ہے...... اور جیت کر دکھاتا ہے......'' اس نے فخریہ اپنے گھوڑے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بھی جیت کر دکھاؤں گا......'' ابراہیم کو جوش آیا۔

''پہلے گھاس کھا کر دکھائیں...... ہی ہی ہی......''

تینوں دل کھول کر ہنسے......

ان کے پاس پریکٹس کے لیے دن تھے۔ وہ گھوڑوں کی پیٹھ تھپکتے' انہیں کھانا وانا کھلاتے' تالاب سے پانی پلاتے۔ پھر الٹی چھلانگیں لگاتے تالاب میں نہاتے۔ شام کی گڑ چائے بابا شاوا کی طرف سے ہوتی۔ وہیں گاؤں کے سب بڑے بھی آ جاتے۔ سب مل ملا کر چائے سڑکتے......

یہاں وقت میں بہت برکت تھی۔ دن گزرتا نہیں تھا' وقت ڈھلتا نہیں تھا' آسمان کی طرح ٹھہر کر بڑا تسلی بخش سا لگتا تھا۔ ایک ایک سانس اپنی موجودگی کی خبر دیتی تھی۔ یہاں افراتفری اور بھاگم دوڑ کا کہیں کوئی نشان نہیں تھا۔ کیا یہاں کے لوگ اتنے صابر شاکر تھے کہ زندگی کا کارواں یہاں پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ کیا یہ وہی خطہ زمین نہیں تھا جو قتل' ظلم' ناانصافی سے پاک تھا اور اسی لیے وقت برکت' فضاء رحمت اور زندگی فضل و کرم سے مامور تھی۔ عقل والے ان ہی خطوں کی طرف ہجرت کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ رحمت کے فرشتے یہاں پرواز کرتے ہیں......

وہ لمبی گھاس سے لہلہاتے اونچے نیچے راستوں پر چہل قدمی کرتے گاؤں کی خوب صورتی پر فدا ہوتے۔ ہر طرف سبزا ہی سبزا تھا۔ اللہ نے سبز رنگ کو بہت پسند کیا ہے۔ ساری دنیا سبز رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ سکون کے سارے خزانے سبز رنگ کی ملکیت میں ہیں۔ یہ انسانی آنکھ کو ٹھنڈک' اور انسانی دل کو سکون اور اُمید دیتا ہے۔ صوفیوں نے بھی اسی لیے اس رنگ کو پسند کیا ہے۔

سبز، نیلی، پیلی، اور گلابی کاغذی جھنڈیاں......

''یہ ہو کیا رہا ہے......انہوں نے ریس کو اتنا سیریس لے لیا ہے؟'' طلال نے حیرت سے چیخ ہی ماردی۔

وہ تینوں ذرا اوپر ٹیلے پر کھڑے تھے۔ نیچے کھلا میدان تھا۔ چھوٹے بچے رسی کے ساتھ جھنڈیاں لگا رہے تھے۔ بین حرم ووی کے میدان کی طرح انہیں گول گول گھومنا تھا۔ سفید چاک سے حد بندیاں کی جا رہی تھیں۔ بابا جی شاوا' ہر کام میں پیش پیش تھے۔ شام چار بجے ریس کا وقت تھا۔ ادھر ادھر ٹیلوں، درختوں پر بچوں کا ہجوم آ کر جمع ہو چکا تھا۔ کچھ بڑے بوڑھے بھی موڑھوں' چارپائیوں پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ایک بچہ نقلی پستول چلا کر' گولی کے پٹاخے کو چیک کر رہا تھا۔ پستول نقلی تھی لیکن اس کا پٹاخہ بڑا اصلی تھا۔ اتنی زور سے گونجا کہ اوپر کھڑا ہادی اس کی گونج سے سہم سا گیا۔

''یار یہ کون لوگ ہیں یار......'' سینے پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا۔ پٹاخے نے اس کے دل کی دھڑکن کو بڑھا دیا تھا۔

یار لوگ' انہیں نیچے سے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے اور گھڑی کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ بس وقت ہونے ہی والا ہے۔ وقت ہونے ہی والا تھا اسی لیے گاؤں کی سادہ بھولی بھالی عورتیں بھی اس طرف آ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے رش بڑھنے لگا۔ شاید ساتھ کے گاؤں کے لوگ بھی آئے تھے۔ تینوں نے سہم کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''دیکھنا کہیں ٹی وی چینل والے بھی تو نہیں آئے ہوئے۔ بہت بےعزتی ہونی ہے آج۔'' طلال نے آنکھیں سکیڑ کر ہجوم کو گننا چاہا۔

''ہاں یار ذرا چیک کرو' پتا چلے لائیو ٹیلی کاسٹنگ ہو رہی ہے......'' ابراہیم کان کھجانے لگا۔ انہیں یہ گاؤں اچھا لگا تھا' یہاں کے سادہ' بھولے بھالے لوگ بھی......

لیکن یہ معصوم بھولے بھالے لوگ......اب چالاک ہو رہے تھے' ان کی جان نکالنے والے تھے......دیکھو ذرا!

☆ ☆ ☆

ان کی گھوڑا گاڑی کے دائیں بائیں ایک ایک بچی کی گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ تیل لگا کر کس کر بال بنائے ہوئے' سروں پر دوپٹے لیے ہوئے۔ بہت اعتماد سے گھوڑوں کی لگامیں پکڑ کر' گھوڑوں کے کانوں کی طرف جھک جھک کر سرگوشیاں کرتے ہوئے' وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھیں۔

ان کی دیکھا دیکھی ہادی بھی گھوڑے کے کان کی طرف جھک گیا۔ ''میرے شیر' میرے گلفر' جتوا دینا یار! اللہ تیرا بھلا کرے گا۔''

اللہ بھلا ہی کرنے والا تھا......مقابلہ شروع ہونے سے پہلے انہوں نے دائیں بائیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کیا۔ ابراہیم نے سر اٹھا کر تیسرے نمبر پر کھڑے ہادی اور پہلے نمبر پر کھڑے طلال کو دیکھا اور ہاتھ لہرایا۔ اس نے دونوں سے کہہ دیا تھا کہ اب طے پا ہی گیا ہے تو وہ جیتنے کی پوری پوری کوشش کریں۔ یعنی ان تین میں سے کوئی ایک تو جیتے۔

نقلی پستول کا اصلی پٹاخہ گونجا......

چھ کے چھ نے اپنی اپنی لگاموں کا جھٹکا دیا۔ کوشش کر کے انہوں نے حلق سے مائی بھتاں جیسی آوازیں نکالنی سیکھ لی تھیں۔ زبان کو

رول کر کر وہ وہی آوازیں نکال رہے تھے...... ابھی شیر' چیتے' کُکڑ کہنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ سب گھوڑے ایک رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ زمین کا سبزا سمٹ کر ان کے گرد آ گیا اور انہیں اپنی بانہوں میں لے لیا۔ نیلا آسمان' سفید بادل' سورج کی ٹھنڈی روشنی' ان کے ساتھ بھاگنے لگے۔ ہادی اور طلال نے ہر شے کو اپنے گرد گھومتے پایا......

پہلا چکر شروع ہوا......

اللہ نے زندگی کو پسند کیا' اسی لیے اسے بنانا۔ اپنے لیے ''بندگی'' کو اسی لیے بندے میں روح (زندگی) پھونکنے کو۔

دوسرا چکر ختم ہوا......

زمین کہیں گلستاں ہے' کہیں صحرا' کہیں اجاڑ' کہیں آباد۔ راکھ اور پھول' کنکر' اور دھول...... اور یہی انسان کی زندگی......

تیسرا چکر...... آخری چکر......

ہر شے' ہر عمل' ہر فرض کی قضاء ہے...... ''زندگی کی نہیں''...... ہر گناہ کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے' لیکن زندگی کی معطلی کے لیے نہیں۔ زندگی میں موت واجب نہیں۔ زندگی فرض اولین ہے۔ پہلی سانس سے' آخری سانس تک۔ اس فرض کی کوئی قضا نہیں۔ جینا ہی ہے...... جینا ہی ہوگا...... موت کی طلب حرام ہے' موت کی طرف پیش قدمی حرام ہے...... موت پر گرفت حرام ہے......

طلال اور ہادی نے لگاموں کو قوت لگا کر جھٹکا دیا۔ ان کے حلق سے پر جوش آوازیں نکلیں۔ اس آخری چکر میں انہیں اپنی پوری جان لگا دینی تھی...... انہوں نے لوگوں کے شور کو داد سمجھا...... ساتوں آسمانوں کو مہرباں پایا......

ہادی وننگ لائن کراس گیا...... پیچھے ہی طلال...... نقلی پستول کے اصلی پٹاخے ترتیب سے پٹاخ پٹاخ گونجے' گاؤں والوں کا شور اور بچوں کی تالیاں......

سب سے آخر میں ابراہیم نے لائن کراس کی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں' وہ انہیں آستین سے پونچھنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

''ہم جیت گئے یار......'' ہادی چھلانگ لگا کر طلال کی گھوڑا گاڑی میں کود گیا تھا۔ بابا شاہ بھی اسی گاڑی پر کود گئے تھے۔ گھوڑا گاڑی پر کھڑی بچیاں بھی ان کے لیے تالیاں بجا رہی تھیں۔ نیچے کھڑی مائی پھتاں بھی......

''میں بھی جیت گیا...... یا اللہ تیرا شکر۔'' اس نے ان دونوں کو دیکھا اور پھر سر اٹھا کر آسمان کو۔

☆ ☆ ☆

پیارے قارئین: یہ 'جیت' ان کے علاج کی آخری دوا تھی۔ کڑوی گولیوں کے ساتھ ڈاکٹر ایک میٹھی گولی دیتے ہیں نا؟ یہ وہی گولی تھی۔ جوش و جذبہ بیدار کرنے کا سیرپ......

☆ ☆ ☆

''وہ سامنے اوپر پہاڑی دیکھ رہے ہو؟؟ وہی ہے چاچا امام دین کا ٹھکانہ......''

''وہ دُور...... بہت دور سامنے اوپر...... اتنی بلندی پر......؟؟ ہادی نے حیرت سے چاچا امام دین کو دیکھا۔

''جوان جہان ہو...... بلندیوں سے ڈرتے ہو؟؟''

''نہیں جی وہ...... چڑھائی سے......''

''لفٹ تو یہاں کسی بھی پہاڑ پر نہیں ہے۔ پرندے بھی اپنی پیٹھ پر بٹھا کر اوپر نہیں لے جاتے۔ یہ سروس انہوں نے ابھی شروع نہیں کی نا۔'' بابا شاوا نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

ہادی نے خائف ہو کر طلال نے کھی کھی کرتے ہوئے بابا شاوا کو دیکھا۔ ابراہیم نے سلام دعا لے کر قدم اُوپر کی سمت بڑھا دیئے۔

اللہ نے پہاڑوں کو بہت پسند کیا ہے۔ یہ وہ کیل ہیں جو زمین پر ٹھونکے ہوئے کھڑے ہیں۔ یہ وہ جلیل ہیں جو انسان کو بلندی' حوصلے اور استقامت کی ترغیب دیتے ہیں...... پہاڑ...... یہ امید اور سر بلندی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں......

تینوں چھوٹی سی کوٹھری کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اندر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جگہ کی کمی تھی تو وہ باہر ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ چاچا امام دین بالآخر یہاں انہیں مل گئے تھے......

''جب کوئی مرنے کا ارادہ کرتا ہے' غمزدہ اور پریشان ہوتا ہے تو کیا ساری خدائی خاموش نظارہ کرتی رہ جاتی ہے؟ اللہ کی رحمت جوش نہیں مارتی؟ اللہ کبھی غافل نہیں ہوتا۔ وہ زمین پر انسانوں کو' اور آسمان سے فرشتوں کو ہماری مدد کے لیے بھیجتا ہے۔ لیکن جس کے لیے مدد بھیجی جائے وہ اپنی ضد چھوڑے تو سہی۔ ہدایت کو وصول تو کرے......

بیٹا تم جیسا پوزیشن ہولڈر اسٹوڈنٹ اس بار بورڈ میں صرف پاس ہو گیا' ڈاکٹر بننے کے لیے ایڈمیشن نہیں ملا تو تم نے اپنی کلائی کاٹ لی۔ ایک لمحے کے لیے تم نے رک کر سوچا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کس نے تمہیں روک دیا؟ کسان باپ تمہیں کھیتی باڑی میں لگانا چاہتا تھا' کیا پتا خدا بھی یہی چاہتا ہو۔ دو تین سال کسان بنے رہتے' زمین کو سمجھتے' پرکھتے۔ زرعی سائنس دان بن جاتے۔ جو تم نے سوچا تھا وہی ہو گا تو ہی تم زندہ رہو گے؟ جو اللہ کا پلان ہے وہ ہو گا تو تم خود کو ختم کر لو گے؟؟

بی بی آپ کا جوان بیٹا حادثے میں شہید ہو گیا۔ تین سال گزر گئے اور رو رو کر آپ نے آنکھوں کی بینائی گنوا لی۔ دل کی مریضہ بن گئیں۔ زندگی کو خود پر حرام کر لیا۔ اللہ کو یہ پسند نہیں کہ زندہ انسان خود پر موت کو طاری کرے' لیکن آپ تو صرف بیٹے کی ماں ہیں' اللہ کا بندہ تھوڑی ہیں جو اللہ کی ناراضی کی فکر کریں گی۔ ماں' باپ' بیٹا' بیٹی' یہ رشتے ناطے تو دنیا کے لیے ہیں۔ ہماری پہلی حیثیت بھی بندگی ہے اور آخری بھی۔ جب سارا معاملہ ہی بندے اور بندے کے رب کے درمیان ہے تو آپ صرف ماں بن کر کیوں زندہ ہیں؟ صرف بیٹے کے لیے کیوں مر رہی ہیں؟؟ اللہ کو بھول گئی ہیں؟ بی بی! بیٹے کو یاد رکھیں' اس کی موت کو بھول جائیں...... غم سے نکل آئیں' اللہ کو راضی کریں۔

بیٹا تم بچوں سمیت پہاڑ سے کود رہی تھیں۔ کس لیے؟ کہ جوانی میں بیوہ ہو گئیں؟ تین وقت کی روٹی کے لیے؟ لوگ عزت کے درپے تھے اس لیے؟ رشتہ داروں نے نظریں پھیر لیں؟؟

اللہ کی نظر میں تم ہو...... یہ کیوں بھول گئیں؟ تین بار تم نے مرنا چاہا' تینوں بار اللہ نے تمہیں بچایا۔ اللہ کی محبت کے اور کتنے ثبوت چاہتی ہو؟ جو تمہیں بچانے کے لیے مدد بھیج سکتا ہے' وہ روٹی بھی بھیج سکتا ہے۔ سر کی چھت بھی دے سکتا ہے۔ ایک شوہر کو ہی اپنی کل کائنات

سمجھ لیا تھا؟ اسے اپنا رازق بنا لیا تھا؟

اس دنیا میں لوگ بھوک سے نہیں کم ہمتی سے مرتے ہیں۔ شیطان تمہارے دلوں میں بھوک کے وسوسے ڈال دیتا ہے۔ وہ تمہیں آنے والے وقت کی خوفناک تصویریں دکھاتا ہے۔ وہ تمہیں بتاتا ہے کہ تم تنہا' اکیلے اور کمزور ہو۔ اور تم کم عقل یہ نہیں سوچتے کہ اللہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے......تم تنہا اور اکیلے کیسے ہوئے؟

چھوٹی بی بی آپ کوئی زہریلی چیز کھا چکی تھیں۔ آپ کی ماں بہت پریشان ہیں آپ کے لیے۔ آپ کا رنگ کالا ہے' آپ موٹی' بھدی اور بدصورت ہیں......آپ نے اب تک اپنے بارے میں یہی سب جانا ہے؟؟ ان تین باتوں کے لیے آپ ہر روز موت کی طلب کریں گی؟ اس عظیم رب کو کتنی بار بتائیں گی کہ اس نے آپ میں ایسے ایسے خراب نقص رہنے دیے۔ خوب صورت ہوتیں تو آپ کی جلدی شادی ہو جاتی۔ بس یہی ہے آپ کی کل زندگی کی فکریں؟؟ آپ کا مقصد؟؟ ایک شوہر حاصل کرنا؟؟ خوب صورت نظر آنا؟؟ اپنی جھولی اور نصیب آپ کو خالی دکھائی دیتا ہے۔ اتنی سی وجہ کے لیے پاگل ہو گئی ہیں۔ زندگی کو جہنم بنا لیا ہے۔

اپنا جہنم آپ لوگ خود تیار کرتے ہیں......اپنے ہی ہاتھوں سے......

اس کائنات کی خوبصورتی بھی تمہاری خوب صورتی ہے۔ اللہ نے تمہاری اس صورت کو بنانا پسند کیا اسی لیے بنایا۔ اگر تم بدصورت ہو' تو پھر کائنات کی ہر شے بدصورت ہے۔ اگر مالک اپنی بندگی کے لیے بدصورتی کو پسند کرتا ہے تو بس وہی شے خوبصورت ہے۔ انسانوں کے پیمانوں کی اتنی فکر کیوں کرتی ہو؟ اللہ نے تمہیں اپنے لیے بنایا ہے' اپنی حیثیت کو پہچانو......اللہ کے لیے خوبصورت بنو......

اپنے غموں کو پہاڑ کیوں بنا لیتے ہو؟ صبر کو آگ کے دریا میں کیوں بدل دیتے؟ نہ گھونٹ بھر سکتے ہو نہ پار کر سکتے ہو۔ اتنے کمزور تو نہیں پیدا کیے گئے تم۔ پوری عقل اور ساری سمجھ دی گئی ہے تمہیں۔ ساری نشانیاں اور علم۔ پھر کہاں گم ہو؟ کیوں بھٹک رہے ہو؟

اپنی ذمہ داریاں پہچانو۔ غفلت سے جاگو۔ نافرمانی اور ظلم سے بچو۔ انسانوں کے مددگار بنو اور مددگار ہی بنے رہو۔ اپنی عقلوں اور دلوں کے قفل کھولو۔ اللہ کی بے زاری اور مہر سے ڈرو۔ تم خود کو ناکارہ اور نالائق ثابت کرنے پر ہی کیوں تلے ہوئے ہو؟ کیوں اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہو۔ ایک جھٹکا لگتا ہے اور ایمان ڈول جاتے ہیں۔ اللہ پر یقین ڈگمگا جاتا ہے......''اللہ ہے بھی یا نہیں' وہ سنتا بھی ہے یا نہیں' ہم یہ سوال کرنے لگتے ہیں۔ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے' یہاں سب کو آزمائش سے گزرنا ہوگا......سب کو......آزمائشیں بھیس بدل بدل کر آئیں گیں۔ تو کیا کرو گے؟ فیل ہونا پسند کرو گے......؟ پاس ہونے کے لیے کوشش بھی نہیں کرو گے؟

''اتنے کم ہمت نہ بنو......زندگی موت کے شکنجے میں دم توڑنے لگے تو بھی شیر بن کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دو۔''

تینوں شیروں نے سر کو پوری طرح سے اندر کیا اور چاچا جی کو دیکھا......

☆ ☆ ☆

''اسلام علیکم......''سب جا چکے تو وہ ان کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے۔

''وعلیکم السلام......ٹھیک ٹھاک ہو اب؟؟''خوشی سے ان کا چہرہ دمکنے لگا اور انہوں نے اٹھ کر تینوں کو گلے سے لگا لیا۔

چاچا امام دین...... یہ وہی ہیں جن کے پیچھے انہوں نے کھیوڑہ کان میں نماز ادا کی تھی۔

''پھر آپ نے ہمیں یہ امانت کے چکر میں کیوں ڈالا...... یا وہاں آپ کے کوئی جڑواں بھائی تھے؟''

''میری امانت یہ تھیلا نہیں، میری امانت تمہاری تندرستی تھی۔ زندگی کی طرف تمہاری واپسی تھی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ابراہیم نے میری امانت مجھ تک پہنچادی ہے۔ تمہارا شکریہ ابراہیم......'' وہ ابراہیم کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

ہادی اور طلال نے چونک کر ابراہیم کی طرف دیکھا۔

''زندگی کی محراب پر لکھی تحریر کا پہلا لفظ 'موت'' ہے۔ موت جوڑ ہے، توڑ نہیں۔ وقت مقررہ پر، اللہ کے حکم کے ساتھ۔ نہ لمحہ پہلے، نہ لمحہ بعد۔ موت کو یاد رکھنا عبادت اور اس کی چاہ کرنا گناہ ہے۔ موت بری شے نہیں، یہ اگلی منزل کی طرف سفر کا نام ہے۔ یہ سفر اسے ہی نصیب ہوگا، جس نے زندگی کی ٹرین میں بیٹھ کر جھکڑوں، طوفانوں، تکلیفوں، دکھوں، آزمائشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہوگا۔ اسے نہیں جو بیچ راستے میں ہی ٹرین سے کود گیا ہوگا۔ زندگی کے فرض کی کوئی قضا نہیں ہے ہادی...... زندگی کی ہر سانس فرض اولین ہے طلال......''

دونوں خاموشی سے سنتے رہے اور سر ہلاتے رہے۔ پھر بابا جی امام دین کے ساتھ گڑ والی چائے سڑک کر باہر آ گئے۔ ابراہیم کے اشارے پر وہ اُوپر اور بلندی کی طرف چڑھنے لگے تھے۔

''یہ سب؟ میں ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا ابراہیم! کوئی پلان تھا؟'' تینوں کنارے سے پاؤں نیچے لٹکا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ دور سارا جہاں دکھائی دیتا تھا۔ ہادی پوچھ رہا تھا۔

''اللہ کے ہر کام میں حکمت، اور ہر بھلائی پلاننگ ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہم ان دونوں کو ہی نہیں سمجھتے۔ میں تمہیں بابا جی امام دین کے پاس لے کر گیا تھا...... بس......''

''تم بابا جی امام دین کو پہلے سے جانتے تھے؟''

''ہاں...... ایک بار ملا تھا......'' اس کی سانس بوجھل ہوگئی۔ ''اب تک تم تھوڑا بہت سمجھ ہی گئے ہوگے۔ بابا جی امام دین نے تمہاری حالت کو پوری طرح سے سمجھ لیا تھا۔ جسمانی، روحانی، ذہنی، سب حالتوں کو۔ ڈاکٹر مریض دیکھ کر دوا تجویز کرتا ہے، تمہاری پہلی دوا بھاء بھولو تھے۔ انہوں نے تمہارے جسم سے ستر سے اسی فیصد بیماری نکال باہر کی تھی......''

ہادی کو پھر سے بھاؤ یاد آ گئے۔ وہ انہیں بہت مس کرتا رہا تھا۔ ''وہ بھی ڈاکٹر ہیں......؟؟''

''ہاں ڈاکٹر...... تم ایک سال سے دوائیوں پر زندہ تھے۔ نیند کی گولیاں کھا رہے تھے۔ قدرتی نیند نعمت ہوتی ہے، یہ نیند تم دونوں کو وہیں آئی تھی۔ انہوں نے ہی تمہارے دماغوں سے منفی سیلز صاف کیے تھے......

اگر انسان دکھ پر صبر نہ کرے تو یہ دکھ ناسور بن جاتا ہے۔ پھر اس ناسور کی جڑیں گہری ہونے لگتی ہیں۔ غم، نا اُمیدی اور مایوسی میں بدل جاتا ہے۔ زیادہ دکھی رہنے اور غم کرنے سے اسے لیے منع کیا گیا ہے۔ سائنس کی عام زبان میں غم کی ان جڑوں کو منفی سیل یا کیڑے کہا جاتا ہے۔ منفی، منفی جمع ہوتا ہے۔ اس طرح منفی جمع ہوتا رہتا ہے، اور دماغ میں منفی کیڑوں کا ڈھیر لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ

ایک بہت بڑا خونخوار جانور بن جاتا ہے۔یہ جانور پورے دماغ کو کنٹرول کرنے لگتا ہے۔ظاہر ہے دماغ دل اور پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے۔اب انسان وہی کرتا ہے جو یہ جانور (منفی دماغی سسٹم) چاہتا ہے۔چونکہ وہ اس سسٹم کو ایکٹو کر چکا ہے، اور پھر کنٹرول نہیں کر پاتا۔

اسی لیے ہمیں منفی جذبوں سے دور رہنے کا درس دیا گیا ہے۔غصہ' نفرت' حسد' لڑائی جھگڑا' دشمنی' غرور' جاہلیت' بے جا غم' وغیرہ۔اسی لیے اسلام نے پہلا درس ''صبر'' قناعت اور درگزر کا دیا ہے کہ ہم ان منفی کیڑوں سے بچے رہیں۔بھاء کی حویلی میں جو جو کچھ ہوا' وہ سب تمہارے جسم سے بیماری نکالنے کے لیے ہوا۔

تمہاری بیماری کا سلسلہ تمہارے دکھوں سے شروع ہوا تھا۔تم نے بھاء کا داؤ ''صبر' رضا' ایمان'' لگا لیا ہوتا تو نوبت موت تک نہ آتی۔جب ان کا کام ختم ہو گیا تو انہوں نے تمہیں صالحہ نور کے پاس بھیج دیا۔جس کے ہاتھوں میں اللہ نے شفاء دی ہے۔

''تو ہمارے اس سفر میں جو جو کچھ ہوا وہ سب کچھ......

''وہ سب کچھ اللہ کی طرف سے تھا۔مدد تھی اللہ کی۔ہمیں لگتا ہے کہ آسمان سے فرشتے اُڑتے ہوئے آتے دکھائی دیں گے تو ہی ہم یقین کریں گے کہ اللہ نے ہمارے لیے مدد بھیجی ہے۔ہمارے لیے کوئی معجزہ ہوا ہے...... ہمارے لیے ہر روز کئی معجزے ہوتے ہیں۔ہمیں ہر روز کئی سبق دیے جاتے ہیں لیکن ہم اپنی بند آنکھیں کھولتے ہی نہیں......''

''اسی لیے ہم بھاء کے ٹرانس میں چلے گئے تھے......؟؟''

''کہہ سکتے ہو......جس انسان نے غم کے پہاڑ سر کیے ہوں' صبر کے سمندر پیے ہوں' اس کی حیثیت معمولی تو نہیں ہو گی۔تم چاہتے بھی تو ان کی حویلی سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔بابا امام دین نے تہجد میں تمہارے لیے دعائیں کی ہیں۔تمہاری زندگی اور سمجھ بوجھ کے لیے انہوں نے اللہ کو بڑی شدت سے پکارا ہے۔اللہ نے انہیں اپنا مددگار چنا ہے......بہت خاص ہیں وہ۔

''تم بابا امام دین سے کیسے ملے تھے......؟؟''

ابراہیم کے چہرے کے رنگ بدلے۔''اسی طرح جس طرح تم ملے تھے۔'' اس کی اداسی بہت دلگرفتہ سی ہو گئی۔

''کیوں مرنا چاہتے تھے تم؟؟ کیا ہوا تھا؟؟'' وہ اب تک ایک ابراہیم کے بارے میں ہی نہیں جان پائے تھے۔

اس کی آنکھیں نم ہوئیں لیکن پھر وہ مسکرا دیا۔''اماں ابا نہیں تھے میرے۔ماموں نے بیٹوں کی طرح پال پوس کر بڑا کیا تھا۔باکسر بھی بنایا۔ان کی بیٹی تھی ایمان۔دوست تھی میری' پھر محبت بھی ہو گئی۔بہت معصوم تھی سی تھی۔اس کا خالہ زاد بھی اسے پسند کرتا تھا۔رشتہ بھی بھیجا لیکن ماموں نے میری وجہ سے انکار کر دیا۔بہت تلخیاں' لڑائی جھگڑے ہوئے۔میں ایشین اولمپک کے لیے گیا ہوا تھا۔پیچھے سے ماموں کا فون آیا کہ گولڈ میڈل لے کر ہی آؤں۔ان کی ناک پر بات آ گئی ہے......

میں نے گولڈ میڈل جیت لیا' شادی کی تیاریاں ہونے لگیں......'' کہہ کر وہ رک گیا۔غیر محسوس اس نے ایک پتھر کو گرفت میں لے لیا۔

''نکاح سے ایک دن پہلے مہندی کی رات ایمان پنکھے سے لٹکی ہوئی ملی تھی۔''

طلال اور ہادی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا..... دونوں نے اپنا اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

''میری خالہ شادی کے لیے مجھے اپنے گھر لے گئی تھیں۔ مہندی کے لیے سارا خاندان وہیں موجود تھا۔ ایمان اپنے گھر تھی۔ اوپر اپنے کمرے میں اکیلی تھی..... وہ اس کے کمرے میں آ گیا.....'' ضبط سے ابراہیم کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔

''وہ بے چاری اپنی بے حرمتی کی چوٹ نہیں سہہ سکی۔ اس چوٹ کے ساتھ وہ میری زندگی میں بھی نہیں آنا چاہتی تھی..... اس نے اسی رات.....''

سارا جہاں نے ابراہیم کے ساتھ ایک سسکی بھری.....

''اگر وہ زندہ رہنے کی ہمت کر لیتی تو میں سب کچھ سنبھال لیتا۔ بس وہ زندہ رہ لیتی.....''

''تم نے کیوں مرنا چاہا پھر.....؟؟''

''نفرت ہو گئی تھی ساری دنیا سے..... لیکن جب زندگی کی قیمت کا احساس ہوا تو فیصلہ کیا کہ اب سلور گولڈ میڈل نہیں لوں گا..... انسانوں کا مددگار بنوں گا..... بابا امام دین کی طرح..... بھاء کی طرح.....''

''تو ہم تمہارے مریض تھے.....'' ہادی ہنس رہا تھا۔

''مریض نہیں..... احسان..... تم وہ احسان ہو جو اللہ کی رحمت نے ہم پر کیا ہے۔ ہمیں بھلائی کے اس نظام میں مددگار بنا کر۔ بھاء، صالحہ، امام دین، یہ سب اور ایسے دوسرے لوگ اللہ کے اس نظام کا حصہ ہیں، جو اللہ نے اپنے بندوں کی مدد کے لیے بنایا ہے۔ یہ سب تو بہت عظیم لوگ ہیں۔ میں تو بس چھوٹا موٹا سا پرزہ ہوں۔ اور شاہ ابھی اسی سسٹم کا حصہ ہیں۔

ویسے تم دونوں کی دوائیاں میرے پاس موجود تھیں۔ طلال تمہارے ماما پاپا گوجرانولہ تک ہمارے پیچھے پیچھے رہے ہیں۔ اور یاد آیا تمہیں بچے نے نمک کی چیزیں دی تھیں کہاں ہیں وہ؟؟''

طلال گڑبڑا گیا..... ''وہ پھول تو میں نے صالحہ کو دے دیا.....''

''کیوں بھلا.....؟؟'' ہادی مسکراہٹ چھپا کر پوچھ رہا تھا۔

''بہت خدمت کی تھی اس نے ہماری.....'' وہ کان کھجانے لگا۔ ''کل ریس کے بعد میں نے بھاء کو فون کیا تھا' کہا کہ ہماری شادی میں آنا ہے۔ کہنے لگے اکیلا نہیں آؤں گا۔ پر تم پہلوانوں کی فوج کو ولیمے کی روٹی کھلا دو گے؟؟ سوچ لو.....''

دونوں نے قہقہہ لگایا۔ ''بڑے تیز ہو یار! لڑکی کو پھول بھی دے دیا' شادی کی ساری پلاننگ بھی کر لی۔ بھاء سے کیا کہا پھر؟''

''وہ تو پھر میں نے ماما سے پوچھا کہ کیا ہم اتنے امیر ہیں کہ پہلوانوں کی فوج کو چند دن مہمان رکھ سکیں؟؟''

ہاہاہا..... تینوں کے قہقہے ایک ساتھ چھوٹے.....

''تمہارا ولیمہ کھانے کے بعد میں واپس جا کر اپنی اسٹڈی مکمل کروں گا۔ یار بچے نے تمہیں 'خنجر' دیا تھا' اس کا کیا مطلب تھا؟؟

''کہ میں تمہارے اندر موجود موت کی خواہش کا گلا کاٹ دوں۔ مجھے اسی وقت یقین ہو گیا تھا' کہ میں جیت جاؤں گا۔''

''بھائی جی! آپ میں شاہین باجی کون ہے جی؟؟'' ایک بچہ ہانپتا ہوا ان کے پاس آیا۔ شاید بابا جی نے بھیجا تھا۔

شاہین باجی نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''کیوں کیا کام ہے......؟؟''

''شاہین کے پر لایا ہوں جی! بابا جی نے کہا ہے آپ کو دے دوں۔ ہم سب بچے وہ وہاں کھڑے ہیں' ذرا اڑ کے دکھا دیں......''

دو تین اور بچے ہنگ گلائڈنگ کے بیگ پیٹھوں پر لادے ہوئے اُوپر چڑھے۔ ہادی نے حیرت سے انہیں اور پھر ابراہیم کو۔ ابراہیم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا' پھر کمر پر مکا مارا...... ''چلو شاباش! ذرا اڑ کے دکھاؤ ککڑ صاب!''

ککڑ' تیتر' بیٹر اور شیر نے جسم پر فٹنگ کی......طلال اور ابراہیم اٹھ کر کنارے پر آ کر کھڑے ہو گئے......

''یا اللہ تیرا شکر ہے......'' ہادی نے کنارے پر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اسے پھر سے ماں یاد آئی لیکن مسکراتی ہوئی' اس کی بلائیں لیتی' اس پر نثار ہوتی ہوئی۔ سر گھما کر دونوں کو دیکھا' جوش سے چلایا اور کنارے سے اٹھ کر آسمان کی طرف اڑنے لگا......

آسمان جو گواہ ہے کہ زندگی ''بلندی'' ہے اور ہم اس کے ''شاہین''۔

☆ ☆ ☆